

## سیاہ فام



محرم فاروق، فرزانہ اور انسپٹر جمشید



اشتیاق احمد

## دو باتیں

اسلام علیکم ! صاف ظاہر ہے، اس بار دو باتیں میں ذکر ہوگا خام نمبر  
 کے ڈاک کا، ہمیشہ یہی ہوتا ہے، لکھ نہیں۔ اس بار  
 یہ ذکر ذرا مختلف ہوگا، خام نمبر کے ڈاک تو معمول کے  
 مطابق اللہ کے مہربانی سے بے اندازہ آئے، لکھ پوری  
 کے پوری ڈاک میں ایک بات مدد دے خام نمبر،  
 اس قدر خام کے خام نمبر میں بھی اس قدر خام کوئی  
 بات نہیں ہوگی اور یقیناً جانیے یہ دیکھ کر ایک خام قسم  
 کے خوش نصیب ہوئے۔ اب آپ بے چہرے ہو گئے ہوں  
 گے، مارے سپنر کے آپ کا حال بُرا ہوگا، لیجیے میں  
 پردہ اٹھائے دیتا ہوں۔ مجھے باقی صرف اتنی کچھ ہے  
 کہ خام نمبر کے سلسلے میں جتنے بھی خطوط موصول ہوئے،  
 ان میں سے ننانوے فیصد خطوط میں خام نمبر کے آخر میں  
 شائع ہونے والے فاروق احمد کے خطوط پر تبصرہ کیا گیا ہے۔  
 اور اس قدر بھرپور الفاظ میں تبصرہ کیا ہے کہ اگر اس تمام  
 خطوط کو شائع کیا جائے تو پوری ایک کتاب بڑھ جائے اور  
 ساتھ ہی یہ بھی آپ سب کو معلوم ہو جائے کہ میرے تائید  
 کو یہ خطوط پڑھ کر کس قدر غصہ آیا ہے، کس قدر دھچکا لگا ہے۔

اور یہ جاننے کے لیے اور بھی خوش ہوں گے کہ ایک بھی خط  
 فاروق احمد کے خطوط کے تائید میں موصول نہیں ہوا۔  
 الحمد للہ۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ اسلام کے شیدائی ایسے قوت  
 کا کہ شیعہ سے نوٹس لیتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ  
 فاروق صاحب جسے خیالات رکھنے والے نکالے ہیں کتنے  
 تعداد میں ہو سکتے ہیں، شاید انہیں انگلیوں پر گنا جا سکے۔  
 جسے تو چاہتا ہے، اسے بھی خطوط کو شائع کر دوں، لکھ  
 اس صورت میں آپ ناول سے محروم رہ جائیں گے اور صرف  
 خطوط ہی پڑھ سکیں گے۔ تاہم جس قدر خطوط بھی شائع  
 کیے جا سکیں، کروں گا۔ کیونکہ یہ وقت کہ ضرورت ہے۔  
 انہ بار کا انعامی سوال بہت آسان ثابت ہوا، لکھ  
 جواب دیتے وقت کچھ جملے بڑھا دیے گئے۔ مالاکنہ صرف وہ  
 خیال گشتا تھا جو محمد کو آیا تھا۔ اس طرح بالکل درست موصول  
 ہونے والے تمام جوابات کو انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔  
 آئندہ ماہ سے انعامی رقم میں اور اضافہ کیا جا رہا ہے۔ امید  
 ہے، یہ بات بھی آپ کے لیے خوش خبری کا دم رکھے  
 گے۔ شکریہ!

محمد علی



## اب کیا ہوگا

وہ اس تحریر کو پہلی مرتبہ جلدی جلدی پڑھ گیا۔ تحریر پڑھ کر اسے بہت حیرت ہوئی، دوسری بار اس نے شہر شہر کر پڑھا تو اور بھی حیرت محسوس کی، یہاں تک کہ تیسری بار پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ خط اسے رجسٹرڈ ڈاک میں ملا تھا، کافی پھولا ہوا لفاظہ تھا، لفاظہ کھولنے پر لمبے چوڑے کاغذ پر یہ تحریر لکھی نظر آئی، ساتھ ہی لفاظے میں اس ملک کے کرنسی نوٹ بھی تھے، بالکل نئے نوٹ۔ اور یہ دس ہزار ڈالر تھے۔ نوٹوں کا پکیٹ دیکھ کر اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اسے تو خط پڑھ کر حیرت ہوئی تھی۔ تحریر کے الفاظ یہ تھے:

"میں اپنے ملک سے یہ تحریر اور دس ہزار ڈالر ارسال کر رہا ہوں۔ اس تحریر کو آپ خود سے پڑھیں اور پھر اپنا کام شروع کر دیں۔ ۲۰ جنوری کو جہاز پر آپ کی سیٹ بک ہے۔ اگر میں نے آپ کو جہاز

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں۔
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں۔
- آپ کے ذمے گھروالوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا۔
- اگر ایضاً باتوں میں سے کوئی ایک بھی باقی ہو تو ناولے المارے سے رکھ دیے، پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیے، پھر ناولے پڑھیے۔

غرض:  
اشتیاق احمد

سے اُترتے دیکھ لیا تو سمجھ جاؤں گا کہ آپ نے میرا کام کرنا منظور کر لیا ہے، میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں اور آپ کے کاموں کو بھی، کیونکہ کافی عرصہ آپ کے ملک میں گزار چکا ہوں۔ میں نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے، میرے ملک میں آکر آپ صرف اپنا کام کریں گے، یہ جاننے کی کوشش ہرگز نہیں کریں گے کہ میں کون ہوں، کام مکمل کرنے کے بعد آپ اپنے ملک واپس چلے جائیے گا۔ آپ کا باقی معاوضہ پہلے ہی آپ کو روانہ کیا جا چکا ہو گا۔ اور آپ کے گھر کے افراد اسے بنک میں جمع کرا چکے ہوں گے، فن کے ذریعے آپ اس بات کی تصدیق بھی کر لیجیے گا اور اگر یہ بات غلط ثابت ہو تو کام درمیان میں چھوڑ دیجیے گا، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ جب ایک کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو پھر کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کا باقی معاوضہ آپ کے گھر اسی سال کو دوں گا، شاید آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے کیا معلوم، آپ کا معاوضہ کیا ہے، میں جانتا ہوں، آپ ہر کیس کا معاوضہ پچاس ہزار ڈالر وصول کرتے ہیں۔ دس ہزار

پیشگی اور باقی چالیس ہزار کام ختم ہونے پر، لیکن چونکہ میں سامنے نہیں آؤں گا، اس لیے کام ختم ہونے سے پہلے ہی باقی چالیس ہزار آپ کے گھر پہنچ چکے ہوں گے، اب آپ یہ ملاحظہ فرمائیں کہ کام کیا ہے۔  
خود سے پڑھیے۔

میرے ملک میں انپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزاد میرے لیے ناپسندیدہ لوگ ہیں، میں انہیں زندہ سلامت نہیں دیکھ سکتا، آپ کا کام یہ ہو گا کہ آپ ان کا کام تمام کر دیں، لیکن یہ بات نوٹ کر لیں کہ یہ لوگ عام لوگ نہیں ہیں، بہت خطرناک، پھرتیلے اور ذہین ہیں۔ بڑے بڑے مجرم ان سے خوف کھاتے ہیں۔ بُری طرح ان سے ڈرتے ہیں۔ انہوں نے سلاٹر، جبرال، جیتال اور کالی آنکھ جیسے مجرموں کو گنتی کا ناپچ نچا دیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سنا ہے کہ یہ لوگ لی کاف اور گائٹا جیسے مجرموں کو بھی موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں، لیکن ابھی تک اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ بہر حال یہ لوگ حدود سے خطرناک ہیں، اس میں کوئی شک نہیں، آپ کو نہایت محتاط ہو کر یہ کام کرنا ہو گا۔ یہ بھی سن لیں کہ انپکٹر جمشید کے بڑے بیٹے محمود



کے جوتے کی ایڑی میں ایک خطرناک ہتھیار۔ اس کا چاقو پھپھکا ہوتا ہے ، اس چاقو سے خبردار رہیں ، موقع ملے ہی اس چاقو کو حاصل کر لیں۔ ورنہ وہ آپ کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے ، اگر آپ اس کام میں کامیاب نہ ہوتے یا آپ نے کام کرنا منظور نہ کیا تو بھی مشکل میں پھنس جائیں گے۔ مشکل میں کس طرح پھنس جائیں گے ، اس کی بھی ایک جھلک دکھا دوں۔ آپ نے آج تک جتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے ، ان کے بارے میں پولیس کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکی ، اسے آپ پر شک تو ضرور ہے ، لیکن آپ کے خلاف اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ آج بھی آزاد پھر رہے ہیں ، لیکن میرے پاس آپ کے چند جرائم کا ثبوت ہے۔ میں ایک بہترین فوٹو گرافر بھی ہوں اور اس فن میں میں نے بہت مہارت حاصل کی ہے ، بلکہ جدید ترین ایجادات سے بھی فائدہ اٹھانا جانتا ہوں ، مطلب یہ کہ میرے پاس تصویری ثبوت موجود ہے۔ ان تصاویر میں آپ کو مجرم کرتے صاف دیکھا جاسکتا ہے ، مزے کی بات یہ کہ آپ نے یہ مجرم ایک آپ

میں رہ کر نہیں کیے۔ اور یہ آپ کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ میں نے یہ تصاویر بالکل محفوظ کر دی ہیں ، شاید آپ کسی طرح مجھ تک تو پہنچ جائیں ، لیکن ان تصاویر تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ میرے علاوہ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کیا ہیں۔ بس ایک شخص کو اتنا ضرور معلوم ہے کہ اگر میں مر جاؤں تو وہ پولیس کو ایک اطلاع دے دے گا ، اس اطلاع سے پولیس جو نتیجہ نکالے گی ، اس نتیجے کی روشنی میں وہ ان تصاویر تک پہنچ جائے گی ، تصاویر کے ساتھ پوری تفصیل بھی ہے۔ اس طرح یہ ثبوت آپ کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا اور آپ کو آپ کے جرائم کی سزا مل جائے گی۔ لیکن اگر آپ نے میرا کام کر دیا تو ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہو گی۔ ہو سکتا ہے ، آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ تصاویر والے معاملے میں ، میں نے جھوٹ سے کام لیا ہے۔ اور گپ لائی ہے تو اس کا ثبوت بھی پیش کر رہا ہوں ، اس لٹافے کے ساتھ ہی آپ کو ایک اور لٹافہ ملے گا ، اس میں سے صرف ایک تصویر نکلے گی۔ اس تصویر کو دیکھ کر میرے اس خط کے ایک ایک



لفظ پر آپ کو اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔ اب میں اپنے خط کو ختم کرتا ہوں اور آپ کو دوسرا لفاظہ کھولنے کی دعوت دیتا ہوں۔ امید ہے، آپ جیسے حوصلہ والا آدمی تصویر کو دیکھ کر گہرا نہیں جائے گا۔ اس قسم کی تین اور تصاویر میرے پاس محفوظ ہیں، گویا میں آپ کو کم از کم چار آدمیوں کا قاتل تو ثابت کر ہی سکتا ہوں۔ فقط۔

آپ کا دوست، آپ کا بھروسہ۔

تیسری بار خط پڑھنے کے بعد اس نے تھمر کر کانپتے ہاتھوں سے دوسرا لفاظہ کھولا اور اس میں سے نکلنے والی تصویر کو دیکھ کر اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ اس تصویر میں ایک بہت مشہور دولت مند کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور مرتے ہوئے دولت مند کا چہرہ تصویر میں اس قدر صاف تھا کہ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آج تک کوئی اس کے کسی جرم کا ثبوت پیش نہیں کر سکا تھا۔ یہ پہلا موقع اس کی زندگی میں آیا تھا اور بہت خوفناک موقع تھا، پھر اس نے خط، نوٹ، تصویر اور دونوں لفاظے جلدی سے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیے اور گھنٹی بجائی، فوراً ہی ایک سیاہ رنگ کا آدمی اندر داخل ہوا :

”کیا حکم ہے ماسٹر؟“

”عمود، فاروق، فرزادہ اور انسپکٹر جمشید؟ اس نے شیشی انداز میں کہا۔“

پل بھر کے لیے سیاہ آدمی کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے اور پھر اس کی زبان فر فر چلنے لگی :

”چاروں انتہائی خطرناک ہیں، ان کے مقابلے میں نکلنے ہوئے اچھے اچھے لوگ گہراتے ہیں، اپنے ملک کے اس حد تک وفادار کہ جان تو دے سکتے ہیں، ملک اور قوم پر کوئی حرف آتا نہیں دیکھ سکتے۔ اپنے مذہب سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتے ہیں۔ اسلام کے خلاف دنیا میں کہیں بھی کوئی کام ہو، یہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بڑی سے بڑی رکاوٹ کو بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ پھر تیلے اتنے کہ گولی کے وار کو بچا جاتے ہیں۔ ذہین اتنے کہ سازش کی بو فوراً بھانپ لیتے ہیں اور انسپکٹر جمشید کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ دوسروں کے ذہن کو پڑھ لیتے ہیں، لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں ماسٹر؟“

”ہمیں یہاں کام کرتے کتنا عرصہ گزر گیا ٹنکی؟“

”قریب قریب سات سات سال۔“

”سات سال میں ہم نے کتنے لوگوں کو ٹھکانے لگایا ہوگا؟“

” شاید سات ؟“

” یعنی ایک سال میں ایک آدمی۔ گویا سال میں صرف پچاس ہزار ڈالر۔ کیا یہ آمدنی ہمیں کافی ہے۔ جب کہ ہمارا پورا ایک ادارہ ہے۔ خفیہ ادارہ۔“

” جی نہیں ! آپ کے اپنے اخراجات ہی اس سے بہت زیادہ ہیں۔ ادارہ تو رہا الگ۔“

” تو پھر یہ خرچہ کس طرح پورا ہوتا ہے ؟“

” جو لوگ آپ سے کام لیتے ہیں ، بعد میں آپ انہیں ساری زندگی بلیک میل کرتے ہیں۔ یعنی ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں۔“ ٹنکی نے مبینہ انداز میں کہا۔

” شکریہ ٹنکی۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہم سال میں صرف ایک واردات اس لیے کرتے ہیں کہ کام پوری احتیاط سے کیا جائے، اپنے خلاف کوئی ثبوت نہ چھوڑا جائے۔ ورنہ کیس تو ہمیں ان گنت ملتے ہیں ، لیکن اس قدر احتیاط کے باوجود ٹنکی۔ میں بہت افسوس سے یہ کہوں گا کہ ہمارا راز اب راز نہیں رہا۔“

” جی۔ کیا مطلب ؟“

” لو۔ خود دیکھ لو۔“

یہ کہہ کر ماسٹر نے وہ ساری چیزیں نکال کر ٹنکی کے آگے ڈال دیں۔ ٹنکی نے حیرت بھری نظروں سے پہلے تو ان کو دیکھا

اور پھر اس خط کو پڑھنے لگا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلتی چلی گئیں۔ آخر خط ختم کر کے اس نے تصویر کو دیکھا اور کانپتی آواز میں بولا :

” آت ماسٹر ! اب کیا ہو گا ؟“

” ہو گا کیا ، اب تک تو ہم لوگوں کو بلیک میل کرتے رہے ہیں ، اب وہ ہمیں بلیک میل کرے گا ، ساری زندگی ہم سے لمبی لمبی رقمیں بٹورے گا ، اس کا پیٹ کبھی بھی نہیں بھرے گا۔ اس لیے انپیکٹر جمشید سے زیادہ مجھے اس کی فکر ہے۔ اگر ہم اس کا پتا نہ لگا سکے تو سمجھ کر بس ڈوب گئے۔“ ماسٹر نے جلدی جلدی کہا۔

” آپ۔ آپ تو مجھے ڈرائے دے رہے ہیں ماسٹر۔“

” یہ بتاؤ کہ اب کیا کیا جائے ؟“

” سوائے اس کے آپ کیا کر سکتے ہیں کہ انپیکٹر جمشید کے ملک جا کر اس کا اور اس کے بچوں کا کام تمام کر دیں اور اس کے بعد اس نامعلوم گاہک کو تلاش کرتے رہیں۔ اس کا سراغ بھی اسی ملک میں لگ سکتا ہے۔ ظاہر ہے ، وہ وہیں ہے۔“

” ہاں ٹھیک ہے۔ تو پھر تیاری کرو۔“ ماسٹر نے کہا۔

” جی۔ تو کیا آپ مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے۔“ ٹنکی نے گہرا کہا۔



”کیا تم نہیں جانا چاہتے؟“

”میں نے اپنے ٹک میں تو ہر معاملے میں آپ کا ساتھ دیا ہے، لیکن انپکڑ جمشید کے ٹک میں جاتے ہوئے خوف سا محسوس ہوتا ہے۔“

”منو ٹنکی۔ ان لوگوں کا کام تمام کرنے کے بعد ہم اس دشمن کا سراغ لگائے بغیر واپس نہیں آئیں گے۔ ورنہ وہ ہمارا مینا حرام کر دے گا، اس کا سراغ لگا کر ہم اس کا بھی کاٹنا نکال دیں گے اور پھر اطمینان سے اپنے ٹک کی راہ لیں گے۔ لہذا تمہیں تو میرے ساتھ چلنا ہی ہو گا۔“

”بہت بہتر ماسٹر۔ جیسے آپ کی مرضی۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن یہ بات ضرور ذہن میں رکھیں کہ میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔ اس نے مجبور ہو کر کہا۔“

”بھئی میں تمہارے ساتھ ہوں، فکر کی کیا بات ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”تو پھر تم بھی ۲۰ جنوری کے جہاز میں سیٹ بک کر لو۔ لیکن ہم ایک ساتھ ایر پورٹ نہیں پہنچیں گے اور نہ جہاز میں ساتھ ساتھ بیٹھیں گے۔ ذرا انپکڑ جمشید کے ٹک میں ایک ساتھ آئیں گے۔ قیام بھی الگ الگ ہوٹل میں کریں گے۔ لیکن ہمیں کس طرح معلوم ہو گا کہ کہاں کہاں ٹھہرے ہیں۔“

”۲۱ کی شام کو میں انٹرنیشنل ہوٹل میں موجود ہوں گا، وہیں ہماری ملاقات ہو گی، لیکن ایسے انداز میں جیسے اتفاق سے ایک میز پر جمع ہو گئے ہوں۔“

”بالکل ٹھیک۔ ٹنکی فوراً بولا۔“

”دہاں ہم ایک دوسرے کے ہوٹل کے بارے میں معلوم کریں گے اور الگ الگ رخصت ہو جائیں گے، اس کے بعد فون کے ذریعے پروگرام طے کرتے رہیں گے۔“

”پروگرام بہت مناسب ہے۔“

”بس تو پھر تیاری کرو۔“ ماسٹر نے کہا۔

اور ٹنکی کمرے سے نکل گیا۔ ماسٹر کا چہرہ فکر کی دھند میں گھر گیا۔



انپکڑ جمشید کے فون کی گھنٹی بجی، وہ اس وقت صبح کی چائے پنی رہے تھے، آج چھٹی کا دن تھا، کپ رکھ کر انہوں نے ریسپور اٹھایا اور بولے:

”ہیلو! انپکڑ جمشید بول رہا ہوں۔“

”خدا کا شکر ہے جمشید، تم بول رہے ہو۔ دوسری طرف سے“



خان رحمان کی چمکتی آواز سنائی دی۔

"کیا مطلب؟ انپکٹر جمشید چونکے۔

"بھئی یہ تم چونکے کیوں؟ خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

"تمہارا جلد سن کر۔ کیا تم یہ خیال کر رہے تھے کہ میری بجائے

کوئی آؤ بولے گا؟ انپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ بات نہیں جمشید! بات تو دراصل یہ ہے کہ انسان کو ہر

حالت میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

"اس میں کیا شک ہے؟

"خیر۔ اب میں مطلب کی بات کرتا ہوں۔ بھئی بس آج تم

میرے ہاں آ جاؤ۔"

"تمہارے ہاں آ جاؤں، لیکن کیوں؟ انھوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی صرف تم نہیں، بچے اور بھابی بھی۔ خوب لطف رہے گا۔"

خان رحمان پُر ہوش لہجے میں بولے۔

"خان رحمان! تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ خوب

لطف رہے گا؟ انپکٹر جمشید نے فوراً کہا اور خان رحمان کی ہنسی منکھل

گئی۔ ادھر محمود، فاروق، فرزاد اور بیگم جمشید بھی مسکرا اٹھے۔

"یاد ہر معاملے میں تو جاسوسی نہ بگھارا کرو۔ بس اب جلدی

سے آ جاؤ۔"

"معلوم بھی تو ہو۔ پروگرام کیا ہے؟"

"یہاں آنے پر ہی بتاؤں گا۔ اور ہاں پروفسر دادو اور شائستہ

بھی آرہے ہیں؟ خان رحمان بولے۔

"اوہو، تم انھیں پہلے ہی فون کر چکے ہو۔"

"یہ بات نہیں، اب فون کروں گا۔ وہ بولے۔

"پھر تم نے یہ کس طرح کہہ دیا کہ وہ بھی آرہے ہیں؟ انپکٹر

جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تو اس میں شک کیسا۔ میں بلاؤں اور وہ نہ آئیں، تم نہ آؤ،

کیا یہ ہو سکتا ہے؟"

"ہو تو خیر نہیں سکتا، لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی سائنس

کانفرنس میں گئے ہوتے ہوں؟ انپکٹر جمشید ہنسنے۔

"یاد پھوڑو اس ہو سکنے اور نہ ہو سکنے کو۔ بس تم آنے کی

کرو۔"

اور ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے ریسپور رکھ دیا، انپکٹر

جمشید بھی ریسپور رکھتے ہوئے بولے:

"نو بھئی۔ تمہارے انگل کا بلاوا آ گیا۔"

"اس سے اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ کہ ان کا بلاوا آ

جائے؟ فاروق نے فوراً کہا۔

"لیکن آیا جان ان کا پروگرام کیا ہے؟"

"انھوں نے بتایا نہیں، وہیں بتائیں گے۔"

" اور کیا پروفیسر انکل کو بھی بلایا ہے ؟ فرزانہ جلدی سے بولی۔

" ہاں ! اب وہ انہی کو فون کر رہے ہوں گے۔"

" تب تو واقعی بہت لگت رہے گا۔ جلدی چلیے۔"

" اب تو جانا ہی پڑے گا۔ انہوں نے بے چارگی کے عالم میں کہا

" چلیے اتنی جان۔ آپ بھی تیاری کیجیے۔"

" کیا مطلب۔ کیا مجھے بھی پلنا پڑے گا ؟ وہ بولیں۔

" جی ہاں ! اس لیے کہ یہ کوئی جاسوسی پروگرام نہیں ہے۔ خالص

تفریحی پروگرام ہے۔"

" اچھی بات ہے۔ انہوں نے کندھے اچکائے۔

آدھ گھنٹے بعد وہ خان رحمان کے دروازے پر دستک دے

رہے تھے۔ ظہور نے دروازہ کھولا تو اس کی شکل پر اڑھائی بجے

نظر آئے۔

" کیوں جیٹی۔ خیر تو ہے۔ تم خوش نظر نہیں آ رہے۔" انسپکٹر

جھینڈ مکرانے۔

" اپنی ایسی قسمت کہاں۔ اس نے سر د آہ بھری۔

" کیا مطلب ؟ وہ حیران ہو کر بولے۔

" آج دس ٹرغ، سونرگیسی کوفتے، بریانی، شبنم اور قورمہ

تیار کرنے کا حکم ملا ہوا ہے، میں اور سسٹنی بیگم صبح سے گدھوں

کی طرح کھانا تیار کرنے میں لگے ہیں۔ ان حالات میں اڑھائی نہیں

میں گے تو کیا صبح کے چار بجیں گے۔"

" اوہ واقعی۔ بات تو ٹھیک ہے۔ تو کیا خان صاحب نے کچھ اور

لوگوں کو بھی دعوت دے رکھی ہے۔"

" جی نہیں۔ صرف آپ لوگوں کو اور پروفیسر صاحب کو۔"

" لیکن ہم لوگوں کے لیے اتنے کھانے کی کیا ضرورت ؟ محمود

بھونچکا رہ گیا۔

" یہ تو خان صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ اس نے منہ بنایا۔

" تو پھر ہمیں ان کے پاس لے چلو۔ ہم ان سے ہی پوچھ لیتے

ہیں۔ اور تم بھی ساتھ آؤ۔"

" مجھے تو بس معاف ہی رکھیے۔ اس نے گڑ بڑا کر کہا۔

" کیوں کیوں۔ فرزانہ مسکرائی۔

" مجھے ساتھ لے جا کر آپ میری مصیبت میں کوئی کمی نہیں کر

سکیں گے۔"

" ادھو۔ جیٹی تم چلو تو سہی۔ فاروق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سب خان رحمان کے کمرے میں داخل ہو گئے :

" بیسیے پروفیسر صاحب۔ وہ آگئے ہیں۔"

" ادھو ! تو پروفیسر انکل پہلے ہی یہاں موجود ہیں۔"

" میں نے کہا تھا نا۔ بھلا یہ کیوں نہیں آئیں گے۔" خان رحمان

چمکے۔



ادھر بیگم جمشید شائستہ بیگم سے مل رہی تھیں، بچے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ چند منٹ تک علیک سلیک کا ہنگامہ جاری رہا۔ آخر انیسٹر جمشید بیٹھنے کے بعد بولے :

”بھئی خان رحمان۔ پہلے تو یہ بتا دو کہ یہ سب کیا ہنگامہ ہے۔ کیوں ہم سب کو جمع کیا ہے ؟“

”جمشید ! تم سے پہلے میں یہ بات پوچھ چکا ہوں، لیکن نہ حضرت بتا ہی نہیں رہے۔“ پروفیسر داؤد منہ بنا کر بولے۔  
”بات دراصل یہ ہے کہ میں نے آپ سب کو یہاں اسی لیے تو بلایا ہے۔“

”کس لیے۔ ارے ہاں۔ ٹھہرو۔ پہلے تو ذرا ظہور کی بات ہو جائے۔“

”ظہور کی بات۔ کیا مطلب ؟ خان رحمان چونکے۔“

”آخر اس قدر کھانا کیوں پکویا جا رہا ہے۔“

”اوہ تو اس نے شکایت لگائی ہے۔ ظہور۔ کتنے مرغ تیار کر رہے ہو۔“ خان رحمان غرائے۔

”جی دو۔ دس۔“

”ٹھیک ہے۔ اب بیس مرغ تیار کرو۔ اور اگر قوری طور پر کرے سے بیکل ڈگئے تو تعداد چار گنا ہو جائے گی۔“

اور ظہور نے دوڑ لگا دی۔

”مارا گیا بے چارہ۔“ بیگم جمشید نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

”بھئی خان رحمان۔ یہ تو اس کے ساتھ زیادتی ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ بیوہ ہیں۔ دل کر پکالیں گے۔“

”لیکن اتنے کھانے کا ہم آخر کیا کریں گے۔“

”وہ بھی بتا دوں گا۔ پہلے تو یہ بات طے ہو جائے کہ ہم

یہاں کس لیے جمع ہوئے ہیں۔“ خان رحمان بولے۔

”ہاں ٹھیک تو ہے۔ جلدی بتاؤ۔“

”بتاؤں کیا۔ مجھے تو خود معلوم نہیں کہ میں نے سب کو یہاں

کیوں جمع کیا ہے۔“

”کیا۔ کیا مطلب !!“ وہ سب چلا اٹھے۔

”انہیں حیرت سے پھیل گئیں۔“

## زبردستی کا پروگرام

سب کی آنکھیں خان رحمان پر جمی تھیں۔ سب کے چہروں پر حیرت بھی تھی، آخر فرزند بولی:

"یہ آپ نے کیا کہا انکل۔ جب آپ کو معلوم ہی نہیں کہ ہمیں کیوں بلایا ہے تو پھر آخر کیوں بلایا تھا؟"

"بس میرا جی پاٹا۔ آپ سب کو یہاں بلاؤں۔ اور میں نے بلایا۔ اب بیٹھ کر کوئی پروگرام بنا لیتے ہیں۔ کھانا پیلے ہی تیار ہونے والا ہے۔ کھانا گاڑی میں رکھ کر کسی طرف کی راہ لیں گے۔"

"یہ تو زبردستی کا پروگرام ہو گیا انکل۔ خازن نے حیران ہو کر کہا۔"

"بھئی اب تم جو بھی سمجھ لو۔"

"چلو بھئی۔ پھر۔ بناؤ پروگرام۔"

"میری ایک تجویز ہے۔ پروفیسر داؤد بولے۔"

"فرمائیے۔ ہم آپ کی تجویز کا خیر مقدم کریں گے۔"

"یہ کہ پروگرام چھوٹی پارٹی بنائے گی۔"

"چلیے ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" خان رحمان بولے۔

"چلو بھئی۔ بناؤ کوئی پروگرام۔"

"تو پھر کیوں نہ ہم سنہری جھیل چلیں۔ اس کے کنارے بہت لطافت رہے گا۔" فرزند نے تجویز پیش کی۔

"لیکن وہاں رونق بہت ہوتی ہے۔ بیگم جمشید گھبرا گئیں۔"

"ہم غیر آباد کنارے کی طرف چلے جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے۔ یہ ایک بہترین تجویز رہے گی۔" خان رحمان بولے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔" پروفیسر داؤد نے بلند آواز میں کہا۔

"مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

دو گھنٹے بعد ان کی کاریں سنہری جھیل کا رخ کر رہی تھیں۔ یہ ایک بہت پرتر فضا مقام تھا۔ لوگ سیر کی غرض سے بہت بڑی تعداد میں ادھر آتے تھے۔ شہر سے قریباً دس کلومیٹر دور تھا۔ اور اس طرح شہر کے ہنگاموں سے بھی دور تھا۔ جھیل بہت بڑی تھی اور اس میں سنہری مچھلیوں کی بہت بڑی تعداد



تھی۔ لوگ ان کا شکار کھیلنے بھی اس طرف آتے تھے؛ تاہم شکار کھیلنے کے لیے لائنس لینا پڑتا تھا۔ جیل کا ایک کنارہ گھنے جنگل کو چھوتا تھا اور اس جنگل میں خطرناک درندے بھی تھے۔ اسی لیے لوگ باگ اس کنارے کا رخ نہیں کرتے تھے۔ ایک دو بار تو جنگل کے درندے اس طرف بھی آگئے تھے اور خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ لہذا ایک کافی اونچا جھٹکا لگا دیا گیا تھا۔ جیل کے اس کنارے تک جانے کے لیے جھٹکے کا لمبا چکر لگانا پڑتا تھا۔ چکر لگا کر وہ دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ ظہور اور اس کی بیگم بھی ساتھ آئے تھے۔

”بھئی خان رحمان! تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اتنا کھانا کیوں تیار کیا گیا ہے؟“

”میں نے سوچا تھا۔ ہم لوگ تو ایسے کھانے روز ہی کھاتے رہتے ہیں، کیوں نہ آج دوسروں کو کھلائیں؟“

”تو ہم اب دوسرے ہو گئے؟“ پروفیسر داؤد برا مان کر بولے۔

”آپ غلط سمجھے۔ میرا مطلب تھا۔ جیل کے اس طرف ایک آبادی ہے۔ پھیروں کی آبادی۔ ہم ان غریب لوگوں کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کریں گے؟“

”بھئی واہ! اس سے اچھا پروگرام تو ہو ہی نہیں سکتا۔“

پروفیسر داؤد بولے۔

”بہت خوب خان رحمان۔ بہت اچھی سوچ ہے۔“

”ظہور! تم کھانا لگانا شروع کرو۔ میں اور جمشید جا کر ان لوگوں کو بلا کر لاتے ہیں۔ کھانا ہمارے پاس بہت کافی ہے۔“

”جی ہنر؟“ ظہور نے کہا۔

انسپکٹر جمشید اور خان رحمان چلے گئے۔ اور وہ ظہور اور سلمیٰ کی مدد کرنے لگے۔ ایسے میں فرزاد کی نظریں جنگل کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ اس بات کو محمود اور نازدق نے فوراً ہی محسوس کر لیا:

”کیا بات ہے فرزاد، خیر تو ہے؟“

”ایسا مضمون ہوتا ہے۔ جیسے جنگل میں کوئی درندہ ہم پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ وہ کسی درخت کی اوٹ میں ہے۔“

”اوہ۔ درندہ؟“ حامد نے گہرا کر کہا۔

”نہا کے لیے فرزاد۔ کوئی جاسوسی چکر نہ شروع کر دینا۔“

”جاسوسی نہیں۔ جنگلی چکر۔“ محمود بولا۔

”میں اسی دقت جنگل میں کسی کی تیز بیج سنائی دی۔ ایک انسانی بیج۔ وہ لرز اٹھے۔“



"اُت خدا۔ یہ۔ یہ کیا ہوا؟" پروفیسر داؤد کانپ کر بولے۔  
"شش۔ شاید کوئی انسان کسی دزدے کے قابو میں آ

گیا ہے۔"

"اُت۔ اب کیا کریں؟"

"کرنا کیا ہے۔ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے کس طرح بیٹھ سکتے ہیں۔ آؤ۔ انکل آپ ان لوگوں کے ساتھ یہیں رہیں۔ محمود نے کہا اور جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔ فاروق اور فرزانہ نے بھی اس کا ساتھ دیا، لیکن ابھی محمود نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ رُک گیا:

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"ہتھیار کے بغیر جنگل میں گھسنا ٹھیک نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے جوتے کی ایڑی میں سے چاقو نکال لیا، چاقو تیا بنوایا گیا تھا، کیونکہ پہلا چاقو زمین دوز دنیا میں رہ گیا تھا۔

وہ جنگل میں آگے بڑھتے چلے گئے، لیکن نہ کوئی دزدہ نظر آیا اور نہ کوئی انسان۔

"کیوں ہمارے کان تو نہیں بچے تھے؟" فرزانہ بولی۔

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اتنے بہت سے آدمیوں کے کان ایک ہی وقت میں کس طرح بچ سکتے ہیں؟" محمود نے منہ بنایا۔  
"تب پھر کہاں ہے وہ دزدہ۔ اور وہ انسان جس کی ہم نے چیخ سنی تھی؟"

"دزدے کو شکار پکڑنے کے بعد ہمارا انتظار تو کرنا نہیں تھا، ہنکل گئے ہو گا کہیں کا کہیں۔"

"ہوں، لیکن خون کے دھبے وغیرہ تو موجود ہونے چاہئیں۔"

"آگے بڑھتے چلو۔ نشانات ضرور ملیں گے۔" فاروق بولا۔

تینوں بدستور آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جھیل کا کنارہ بہت دور رہ گیا:

"کیوں ہم خطرے میں نہ گھر جائیں؟"

"اللہ مالک ہے۔" فرزانہ بولی۔

اور آخر ایک جگہ انہیں پکڑے کی ایک دھجی بڑی نظر آئی۔  
دھجی نئی تھی۔ اور صاف ستھری بھی۔

"میرا خیال ہے، ہم ٹھیک سمت میں چل رہے ہیں، دزدہ اپنے شکار کو لے کر اسی طرف ہی گیا ہے۔"

"ہوں؟"

کچھ اور آگے چلنے پر انہیں ایک قلم پڑا نظر آیا۔

"اُت خدا۔ انسان شاید دزدے کے پوری طرح قابو میں ہے۔"



فرزاد کانپ اٹھی۔

"کاش! وہ ہمیں نظر آ جائے، پھر ہم اس آدمی کو ضرور پہچانے کی کوشش کریں گے۔" محمود نے سرد آہ بھری۔

"اب ہم بہت دور آگئے ہیں، واپسی بھی آسان نہیں ہوگی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ جنگل خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔" ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟

دو منٹ تک چلتے رہنے کے بعد انہیں ایک جوتا پڑا ملا۔ اب تو وہ کانپ اٹھے:

"شاید وہ آدمی اب ہمیں زندہ نہیں مل سکتا۔"

"اگر ہم نے دوڑنا شروع کر دیا تو۔ تو۔" فرزاد کہتے کہتے رُک گئی۔

"عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تمھارے الفاظ کی گھاڑی تو کے بعد رُک ہی جاتی ہے، اس لیے میرا خیال ہے، ہمیں حیران تو نہیں ہونا چاہیے۔"

"نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔" فرزاد کی بجائے محمود نے سُکرا کر کہا۔

اس پر بھی فرزاد کی آواز سنائی نہ دی تو انہوں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر حیران ہوتے بغیر نہ رہ سکے کہ فرزاد ساکت اور جامہ کھڑی تھی:

"اوہو۔ جی کوئی ثبوت تو نظر نہیں آگیا۔"

"اس سے بھی خطرناک چیز نظر آگئی ہے۔" فرزاد نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"کیا چیز۔ ہمیں تو دور دور تک سوائے درختوں کے اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ یہاں تک کہ درندہ تو کیا۔ کوئی چرند پرند بھی نظر نہیں آ رہا۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں۔ درندوں سے بھی زیادہ خوفناک چیز مجھے نظر آگئی ہے۔ آخر جنگل کے چرند پرند کہاں چلے گئے۔ یہ ان کے سونے کا وقت بھی تو نہیں ہے۔"

"اوہ! محمود اور فاروق کے مزے سے نکلا۔ آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔"

"حقیقت تھی۔ جنگل میں درندہ تو دور کی بات ہے۔ کوئی پرندہ بھی نہیں تھا۔ نہ کسی قسم کی کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔"

"ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے جنگل سو گیا ہے۔" محمود بڑبڑایا۔

"جنگل سو گیا ہے۔ ارے باپ رے۔ اب جنگل بھی سونے لگا۔ ہمارا کیا بنے گا۔"

"پپ۔ پتا نہیں۔" فرزاد ہکلائی۔

"اگر تمہیں بھی پتا نہیں تو پھر تو ہم گئے کام سے۔ ویسے ایک بات ہے۔ فاروق نے سوچ کے انداز میں کہا۔

"کیا بات؟ محمود اور فرزانہ فوراً بولے۔

"یہ کہ یہ کسی نادل کا نام ہو سکتا ہے۔ سوتا جگل۔ اس نے شوخ آواز میں کہا۔

"دعت حیرے کی؟ محمود نے جھنجھلا کر دان پر ہاتھ مارا۔

"اب ہمیں آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ میں خطرے کی بو محسوس

کر رہی ہوں۔ پرندوں کا فائب ہونا بہت عجیب بات ہے۔"

"بھئی ہو سکتا ہے۔ وہ اس درندے سے ڈر کر ادھر ادھر

اڑ گئے ہوں۔ فاروق نے ہنسا کر کہا۔

"عجیب الحق ہو۔ آسمان پر نظر ڈالو۔ ایک بھی پرندہ اڑتا

نظر نہیں آ رہا۔"

"اوہ۔ یہ تو واقعی بہت منفی خیز بات ہے۔"

"وہ رک گئے۔ اور چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ہر طرف

ہو کا عالم نظر آیا۔ اچانک فرزانہ تڑ سے گری، اس کے حلقے

سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ ساتھ ہی اس نے کہا:

"ہل۔ لیٹ جاؤ۔ تم بھی لیٹ جاؤ۔"

"لیکن۔ فرزانہ۔ یہ بیٹھنے کا کون سا طریقہ ہے؟ محمود نے

اس کے نزدیک گرتے ہوئے کہا۔

"میں اس سے بہتر طریقے پر نہیں لیٹ سکتی تھی۔ میرے

دائیں کندھے کی طرف دیکھو۔"

"کیا مطلب؟ دونوں بولکھلا اٹھے، اس وقت تک فاروق بھی

نیچے لیٹ چکا تھا۔

"انہوں نے دیکھا، فرزانہ کا کندھا ٹخن سے سرخ ہو رہا

تھا۔ ٹخن اس کے چپڑوں کو تڑ کرتا جا رہا تھا۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا فرزانہ؟"

"جے آواز فائر۔ گولی میرے کندھے سے رگڑ کھاتی گزر

گئی۔"

"اوہ؟ دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا، پھر محمود نے

کہا۔

"یہ بہت بُرا ہوا، ہم جھیل سے بہت دُور نکل آئے ہیں۔

جھیل سے شہر بھی نزدیک نہیں۔ اور تمہیں ہلٹی امداد کی فوری

ضرورت ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں اس حد تک زخمی نہیں ہوں۔ پہلے تو

خود آور سے بیٹھا ہو گا۔ اگر ہم نے ایسے میں صرف بھاگ

نکلنے کی کوشش کی تو ہم میں سے ایک بھی نہیں بچے گا۔ وہ

جو کوئی بھی ہے۔ بہت خطرناک ہے۔ پہلے تو اس نے کسی



گیس کے ذریعے یا کسی اور طریقے سے درندوں اور پرندوں سے اس جگہ کو صاف کیا، پھر بیچ کی آواز حلق سے نکالی اور پھر اپنی چیزیں گراتا پلا گیا۔ تاکہ ہم جیل سے دور ہو جائیں۔ اور جب کافی فاصلے پر آکر ہم رک گئے تو اس نے جان لیا کہ اب ہم خطرے کو بھانپ چکے ہیں۔ لہذا اس نے فائر کر دیا، لیکن قسمت اچھی تھی کہ نشانہ کسی قدر چوک گیا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو مناسب ہو گا کہ میں میں اسی وقت تمھاری طرف گھومی تھی۔ جب فائر کیا گیا اور اگر میں گھوم نہ گئی ہوتی تو اس وقت شاید میری لاش پڑی ہوتی۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں باقاعدہ سازش کا شکار بنایا گیا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہوں! تم ٹھیک کہتی ہو۔ خیر تم آرام سے لیٹی رہو۔ اب ہم اسے دیکھ لیں گے۔ ان شاء اللہ وہ ہمارے ہمت سے پنج نہیں سکے گا۔"

اب دونوں نے لیٹے لیٹے چاروں طرف کا جائزہ لیا، لیکن دشمن کے آثار کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ تھوڑی دیر پہلے جس طرف سے فائر ہوا تھا، اس طرف بھی کوئی نظر نہ آیا۔ گویا دشمن کہیں چھپا ہوا تھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں فاروق۔ ہم بہت بڑے خطرے

میں گھر گئے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اس کے پاس پستول ہے۔ اور ہمارے پاس صرف ایک چاقو۔ لہذا اب ایک ہی حل ہو سکتا ہے۔"

"اور وہ کیا؟ فاروق نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ کہ ہم دونوں مخالفت سمت میں بڑھیں اور کسی نہ کسی طرح جیل تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اگر دشمن صرف ایک ہے تو اس صورت میں وہ صرف ہم میں سے ایک کو الجھا سکے گا۔ محمود نے کہا۔

"اور فرزانہ کا کیا کریں؟

"فرزانہ کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر میں دائیں طرف سے چکر کاٹ کر جیل تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم بائیں طرف سے۔ لیکن اس سے پہلے فرزانہ کو صورت حال بتانا ہو گی۔"

"تم جاؤ۔ میں اسے بتا کر آگے بڑھوں گا۔" محمود نے کہا۔

فاروق پیسنے کے بل رہینگے لگا۔ محمود نے فرزانہ کا رخ کیا۔ لیکن اس کے پاس پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس نے آسمان پر ایک نظر ڈالی اور واپس نہڑا۔ اب وہ بھی نیم دائرے میں جیل کا رخ کر رہا تھا۔ فرزانہ کو اس طرح چھوڑ جانا حد درجے خطرناک تھا، لیکن وہ اس کے سوا

کچھ کر بھی تو نہیں سکتے تھے۔

اچانک اسے رُک جانا پڑا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

## جاسوسی چکر

پروفیسر داؤد نے فکر مندانہ انداز میں جیل کے کنارے رہ جانے والے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی اور سرد آہ بھری :  
 "کیوں انکل ! آپ نے اس قدر سرد آہ کیوں بھری؟" حامد حیلان ہو کر بولا۔

"اس لیے کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی جاسوسی چکر شروع ہو چکا ہے۔"

"جاسوسی چکر، لیکن انکل۔ یہاں جاسوسی چکر کا کیا سوال۔ انکل اور آبا جان غریب لوگوں کو بلاتے گئے ہیں۔ جنگل میں کسی آدمی کی بیچ سسٹائی دی تھی۔ محمود، فاروق اور خزانہ اسے بچانے کے لیے جنگل میں داخل ہو گئے۔ تو اس میں جاسوسی کہاں سے آگئی؟" سرد بولا۔

"جی نہیں جانتے۔ یہ لوگ کہیں پہنچے نہیں اور جاسوسی چکر شروع ہوا نہیں۔ اسی لیے تو میں ان کے ساتھ کوئی تفریحی پروگرام



بناتے ہوئے ڈرتا ہوں ، لیکن اس بار تو ڈرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔

”خیر گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آبا جان اور انکل تو آنے ہی والے ہوں گے۔“

اور اسی وقت انھوں نے دُور سے کچھ لوگوں کو آتے دیکھ لیا :

”بیجے۔ شاید وہ لوگ آگئے۔“ ثنائت نے فوراً کہا۔

”میں آبا جان کو پہچان چکی ہوں۔“ ناز نے خوش ہو کر کہا۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ انھیں بالکل صاف نظر آنے لگے تھے۔ ظہور اور سُلّی اس وقت تک اپنا کام مکمل کر چکے تھے اور اب تو گویا مہمانوں کا انتظار تھا۔ مہمان آنے ہی والے تھے :

”دیکھو جی۔ آتے ہی اگر وہ محمود ، فاروق اور فرزاد کے بارے میں پوچھیں تو صرف یہ کہہ دینا کہ اس طرف گئے ہیں ، تاکہ مہمانوں کو کوئی الجھن نہ ہو اور وہ بے فکری سے کھانا کھا سکیں۔“ پروفیسر داؤد نے انھیں ہدایت دی۔

”جی بہتر۔“ وہ ایک ساتھ بولے۔

آخر سب لوگ نزدیک آگئے۔

”ہاں جی۔ کیا کھانا لگ چکا ہے۔“ خان رحمان بولے۔

”جی ہاں بالکل۔“ ظہور نے فوراً کہا۔

”چلیے حضرات۔ ڈش جالیے۔ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”آپ۔ آپ لوگ بھی کھائیے نا۔“ ایک پھیرے نے کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہم سب ایک ساتھ کھائیں گے۔“

اور وہ بیٹھ گئے۔ اسی وقت انپیکٹر جمشید دُور سے چوکے :

”ارے۔ یہ محمود ، فاروق اور فرزاد نظر نہیں آ رہے؟“

”اس طرف گئے ہیں۔“ پروفیسر داؤد نے جھگل کی طرف اشارہ کیا۔

”بس ان میں یہی تو بُری بات ہے۔“ پچلے نہیں بیٹھ سکتے۔“

انھوں نے بڑا سامنہ بنا کر کہا۔

”اور میرے خیال میں یہ بُری نہیں۔ اچھی بات ہے۔“ خان

رحمان مسکرائے۔

”تم تو بس ان کی تعریف ہی کرتے رہتے ہو۔“

”اور کیا کروں۔ میں مجبور ہو ہوں ایسا کرنے پر۔“

”جمشید ذرا ادھر آکر میری بات سن لو۔“ پروفیسر داؤد نے دہی

کاوڑ میں کہا۔

”خیریت تو ہے۔“

”پتا نہیں۔“ پروفیسر داؤد بولے۔

”یہ آپ دونوں کیا کھسر پسر کر رہے گئے۔“ خان رحمان نے منہ بنایا۔

پروفیسر داؤد نے جیسے ان کا جھڈنا ہی نہیں، انپکٹر جمشید کا ہاتھ پکڑ کر قدرے فاصلے پر چلے آئے اور بولے :

"میں نے ان لوگوں کے سامنے ذکر کرنا مناسب خیال نہیں کیا، بے چاروں کو کھانے سے ہاتھ روکنا پڑتا۔"

"آپ نے اچھا کیا، لیکن بات کیا ہے؟  
"جنگل سے ایک انسانی چیخ کی آواز آئی تھی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ رُک نہ سکے، فوراً آواز کی سمت میں چلے گئے۔"  
"انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔"

"آخر یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں الگ الگ۔" خان رحمان نزدیک آتے ہوئے بولے۔

"ہمارے جانے کے بعد جنگل میں ایک انسانی چیخ ابھری تھی، محمود، فاروق اور فرزانہ آواز کی سمت میں گئے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے ان غریبوں کے سامنے اس لیے یہ بات نہیں بتائی کہ وہ ہماری وجہ سے کھانے سے ہاتھ نہ اٹھائیں۔"

"ہوں ٹھیک ہے، پھر اب کیا کرنا ہے؟" خان رحمان بولے۔

"میں اور تم جنگل میں چلتے ہیں، پروفیسر صاحب اور باقی لوگ ان کے ساتھ کھانے میں شریک رہیں گے۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ آؤ چلیں۔"

دونوں پروفیسر داؤد کی بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہوئے۔  
ابھی انہیں چلتے چھد منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک درخت کے پیچھے کسی کی جھلک نظر آئی :

"ہوشیار۔ میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔"

"یہ تو ہونا ہی تھا۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"کیا مطلب۔ کیا ہونا تھا؟" انپکٹر جمشید بولے۔

"یہ کہ ہم سب لوگ سیر کے لیے نکلتے تھے۔ کوئی نہ کوئی کیس تو پلے پڑنا ہی تھا آخر۔"

"اگر تمہیں معلوم تھا کہ یہ بات ہو کر رہے گی تو پھر پروگرام کیوں بنایا؟" انپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا کیا جائے۔ مدت سے کوئی پروگرام نہیں بناتا تھا۔"

"اچھا سنو۔ اس درخت کے پیچھے ضرور کوئی چھپا ہوا ہے۔"

ہم دو سمتوں سے اس کی طرف بڑھیں گے۔ تم دائیں طرف سے بڑھو، میں بائیں طرف سے۔ کیا خیال ہے۔ ٹھیک ہے۔"

"ہاں! یہ جنگ کے اصولوں کے عین مطابق ہے، لیکن میں سیر کے لیے گھر سے نکلا تھا، میرے پاس پستول نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

خان رحمان بولے۔

"فکر نہ کرو، میرے پاس بھی نہیں ہے! انپکٹر جمشید مسکرائے۔"

"گویا یہ فکر والی بات نہیں ہے۔ کمال ہے۔" خان رحمان



حیران ہو کر بولے۔

”بھئی فکر والی بات کیونکر ہو سکتی ہے، جب کہ ہم سے پہلے محمود، فاروق اور فرزاد میدان میں کود چکے ہیں اور ان کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔“

”کم از کم محمود کے پاس تو چاقو موجود تھا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ خیر، اب دیر نہ کرو، آج تو ہم باتوں میں محمود اور فاروق کو بھی مات دے رہے ہیں۔“

دونوں دائیں بائیں سے درخت کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ راستے میں آنے والے درختوں کی اوٹ لے رہے تھے۔ آخر دونوں ایک ساتھ اس تک پہنچ گئے، لیکن اس کے پیچھے کوئی بھی چھپا ہوا نظر نہ آیا۔

”لو بھئی۔ تمہارا خیال بے بنیاد نکلا۔“

”نہیں بھئی۔ کوئی ضرور اس درخت کے پیچھے چھپا تھا۔ ہو سکتا ہے، اس کے ہماری موجودگی کو بھانپ لیا ہو اور یہاں سے کھسک۔ ارے۔ یہ دیکھو۔ ٹھون کے دھبے۔ گویا وہ زخمی بھی ہے۔ یہ ٹھون کے دھبے ہمیں ضرور اس تک لے جائیں گے۔ آؤ جلدی کرو۔“

ٹھون کے قطرات تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گرے نظر آئے، وہ انہیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے :

”معلوم ہوتا ہے، جنگل میں کوئی گڑ بڑ ضرور ہوتی ہے۔ لیکن محمود، فاروق اور فرزاد کہاں ہیں؟ انپکڑ جمید بڑھائے۔“ صاف ظاہر ہے، ہوں گے تو جنگل میں ہی۔“ خان رحمان بولے۔

”بھئی داد! تم تو فاروق کی جگہ لے رہے ہو۔“ انپکڑ جمید بنے۔

”اور پھر ایک جگہ ٹھون کے دھبے ختم ہو گئے، لیکن اس پاس کوئی زخمی آدمی نظر نہ آیا :

”یہاں سے وہ زخمی شاید ہوا میں اڑ کر کسی طرف گیا ہے۔“ خان رحمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”یا پھر اس کے جسم سے ٹھون بہنا بند ہو گیا ہو گا۔“

”اوہ ہاں! یہ بھی ہو سکتا ہے، بلکہ ضرور یہی بات ہے۔“

”ابن اسی وقت ان کو دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی، لیکن آواز کافی دور سے آتی محسوس ہوئی تھی، ان کے کان کھڑکے ہو گئے۔“

”اؤ خان رحمان۔ اب میں نہیں رُک سکتا۔“

دونوں اسی سمت میں دوڑنے لگے۔ تین منٹ تک تیز رفتاری سے دوڑنے کے بعد انہیں ایک آدمی نظر آیا، وہ کسی کو کندھے

پر ڈالے بے تحاشہ دوڑا جا رہا تھا۔

"خان رحمان۔ اس کے کندھے پر کون ہے؟"

"لگ۔ کوئی لڑکی۔ شاید یہ کسی لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔" خان رحمان کانپ اٹھے۔

"نہیں خان رحمان۔ یہ فرزند ہے۔" انپکٹر جمشید چلائے اور پوری رفتار سے دوڑنے لگے۔ عین اسی وقت ایک فائر ہوا اور وہ منہ کے بل زمین پر گرے۔ ان کے ساتھ ہی خان رحمان بھی گرے۔

"تت۔ تم۔ تم ٹھیک تو ہو جمشید؟"

"ہاں، اگر میں مرنے میں دیر لگاتا تو پھر شاید ٹھیک نہ ہوتا۔"

"کم از کم۔ یہ گولی ماسے سے تو آئی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ جھاگتے ہوئے اس طرف فائر کرتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پیچھے بھی اس کا کوئی ساتھی موجود ہے۔"

"دیکھا خان رحمان، میں نے خطرے کی بو ٹھیک سونگھی تھی۔ یہ لوگ فرزند کو لیے جا رہے ہیں۔ اسے اغوا ہونے سے بچانے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ تم پستول والے کو روکنا ہیں۔"

"ٹھہ۔ ٹھیک ہے۔"

یہ کہتے ہی خان رحمان نے اپنا رخ پیچھے کی طرف کر لیا اور

انپکٹر جمشید نے اٹھ کر ایک بار پھر دوڑ لگا دی، لیکن فوراً ہی ایک بار پھر فائر ہوا اور اس بار انھیں اپنی دائیں پٹلی میں آگ سی لگتی محسوس ہوئی۔ ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا جمشید۔ کیس گولی تمہیں لگ تو نہیں گئی؟"

"میری فکر نہ کرو۔ پستول والے کو روکنے کی کوشش کرو۔"

یہ کہتے ہوئے انپکٹر جمشید نے دوڑنا جاری رکھا۔ خان رحمان نے چادوں طرف نظریں دوڑائیں، لیکن حملہ آور انھیں کیس بھی نظر نہ آیا۔ اب تو وہ بہت حیران ہوئے۔ ادھر اس کی طرف سے تیسرا فائر نہیں ہوا تھا اور انپکٹر جمشید کافی دور نکل گئے تھے۔ انھوں نے اب درختوں کے اوپر والے حصے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اور اچانک ایک درخت کی شاخوں میں چھپا دشمن انھیں نظر آ گیا:

"اوہ۔ تو وہ اوپر موجود ہے۔ اور ہم اسے نیچے دیکھ رہے تھے، خیر۔ اب میں اسے نیچے آنے پر جمشید کے پیچھے تو ہرگز نہیں مانے دوں گا۔"

انھوں نے دل ہی دل میں کہا کہ وہ اپنے کے بل بیٹھتے ہوئے ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے دشمن کو نیچے آنے دیکھ لیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں اب بھی پستول موجود تھا۔ مناسب فاصلے پر پہنچ کر اس نے درخت پار سے پھلانگ لگا دی۔ عین اسی وقت خان رحمان نے درخت کی اوٹ



سے نکل کر اس پر چلا گیا۔ وہ منہل نہ سکا، تاہم اس نے پستول والے ہاتھ کو استعمال کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اور اس کی نالی خان رحمان کے پیٹ میں بھونک دی۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹریجر دباتا، خان رحمان نے نالی پر ہاتھ مار کر اسے پیٹ سے الگ کر دیا، ایک فائر ہوا اور گولی کسی درخت میں پیوست ہو گئی۔ ساتھ ہی خان رحمان نے دوسرے ہاتھ کا ایک ہتکا اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔ یہ ہتکا کچھ اس دور سے لگا کہ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ خان رحمان نے موقع مناسب جانا اور پے در پے کئی ہتکے اس کے رسید کر دیے، پھر پستول اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور اسے چھوڑتے ہوئے بولے:

"ہاتھ اوپر اٹھا دو دوست۔"

اس نے مشینی انداز میں ہاتھ اٹھا دیے۔ ناک سے بہنے والے خون نے اس کے چہرے کو اور خوفناک بنا دیا تھا۔ یہ ایک لمبا چوڑا اور مضبوط جسم کا آدمی تھا:

"تم کون ہو دوست؟" خان رحمان طنز پر لہجے میں بولے۔

"م۔ م۔ م۔ میں۔ میں۔" وہ ہکلا دیا۔

"خیر۔ تمہارا نام میں تو ہرگز نہیں جو سکتا۔" خان رحمان نے پھر طنز پر لہجے میں کہا۔

اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

"تم یوں نہیں بلو گے۔ ٹھہرو۔ بتانا ہوں۔" یہ کہہ کر خان رحمان پستول والا ہاتھ بند کر کے اس کی طرف بڑھے۔

"م۔ م۔ میں جاکی ہوں۔ جاکی۔"

"جاکی۔ یہ کیا ہوتا ہے؟"

"یہ میرا نام ہے۔"

"اور تمہارا کام کیا ہے۔ دوسروں پر گولیاں برسانا۔ خیر ہاتھ اوپر اٹھائے میرے آگے آگے چلو۔ خبردار کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں ایک ریٹائرڈ فوجی ہوں، گولی چلانا بخوبی جانتا ہوں۔"

وہ اسے جھیل کے کنارے لے آئے۔ یہاں پچھلے کھانے کے ساتھ پوری طرح انصاف کر چکے تھے اور دسترخوان پر کھانے کی ایک چیز بھی باقی نہیں بچی تھی۔ انہیں آتے دیکھ کر سب لوگ ہونک اٹھے، پستول دیکھ کر تو وہ خوف زدہ ہو گئے:

"یہ ایک مجرم ہے۔ ہمیں اسے پولیس کے حوالے کرنا ہے۔ لیکن پولیس کو فون کرنے کے لیے کافی دور جانا پڑے گا۔ لہذا اسے باندھا ہو گا، تاکہ یہ کوئی غلط حرکت نہ کر سکے۔"

انہوں نے مل کر اسے باندھا، پھر خان رحمان پچھروں سے نااطب ہوئے:

"جب تک میں پولیس کو فون کر کے نہ لوٹ آؤں، آپ سب

لوگ یہیں رہیں گے۔ تاکہ یہ بھاگنے کی کوئی گمشدہ نہ کر سکے۔  
 "آپ فکر نہ کریں، ہم اس کے فرشتوں کو بھی نہیں بھاگنے  
 دیں گے۔"

خان رحمان ایک کار میں بیٹھ کر شہری حدود کی طرف روانہ  
 ہو گئے۔ فون کر کے لوٹے تو حالات بچوں کے ٹولے تھے۔  
 ابھی تک انپیکٹر جمیل یا محمود، فاروق اور فرزاد میں سے کوئی لوٹ  
 کر نہیں آیا تھا، پھر آدھ گھنٹہ بعد اکرام اپنے ماتحتوں کے ساتھ  
 وہاں پہنچ گیا۔ حملہ آوروں پر نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے نکلا:  
 "اوہو۔ یہ تو جاکی ہے۔"

## اکلا قدم

انپیکٹر جمیل اس کے پیچھے دوڑتے چلے گئے۔ اگرچہ ان کی  
 پٹری تھی ہو چکی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اسی کے پیچھے  
 دوڑ رہے تھے۔ وہ اندر کر بھی کیا کہتے تھے، کوئی شخص فرزاد  
 کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا، یہ کس طرح ہو سکتا تھا، وہ اسے  
 جانے دیتے۔ جب تک جسم میں سکت تھی۔ وہ اسے روکنے کی  
 کوشش کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

اب درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جب کہ  
 پہلے درمیانی فاصلہ کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہ بات محسوس  
 کرتے ہوئے انہوں نے منہ سے آواز کی آواز نکالی، لیکن آواز  
 دور سے نہ بکل سنی۔ انہوں نے ایک بار پھر کوشش کی، لیکن  
 فاروق اور فاروق کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب انہیں  
 کوئی تعاقب کرنا تھا۔ جیسے بھی ممکن ہو، اپنا پچھو وہ دوڑتے  
 چلے، دوڑتے رہے۔ یہاں تک کہ فرزاد کو لے جانے والا



ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ، لیکن دوڑنا انھوں نے پھر بھی نہ چھوڑا ۔ اور پھر انھیں ایک موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی ۔ اس جگہ سے سڑک بھی صاف نظر آ رہی تھی ۔ موٹر سائیکل کے پاس ایک کار کے ٹائروں کے نشانات بالکل صاف نظر آ رہے تھے ۔ وہ سمجھ گئے ، حمد آور کسی کار میں فرزانہ کو ڈال کر اس جگہ سے لے گیا تھا ۔ انھوں نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے شارٹ کیا اور سڑک پر آ گئے ۔ کار کے ٹائروں کے نشانات شہر کی طرف جاتے نظر آئے ، بس پھر کیا تھا ، انھوں نے موٹر سائیکل شہر کی طرف ہی موڑ دی ۔ اب پنڈلی کی تکلیف اور بڑھ گئی تھی ، لیکن فرزانہ کے اغوا کا معاملہ اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا ۔ وہ رفتار بڑھاتے چلے گئے ۔ یہاں تک کہ شہری حدود شروع ہو گئیں ۔ ایک ہوٹل کے پیچھے جتھے میں انھوں نے ایک کار کو کھڑے دیکھا ۔ نہ جانے کیوں انھیں محسوس ہوا کہ مجرم ضرور اسی کار کے ذریعے فرزانہ کو لایا ہے ۔ انھوں نے موٹر سائیکل کار کے پاس روک دی اور ہوٹل کے پیچھے دروازے سے اندر داخل ہو گئے ۔ سامنے ہی انھیں ایک زینہ نظر آیا ۔ دائیں بائیں کوئی کمرہ نہیں تھا ۔ البتہ ایک دروازہ ضرور ہوٹل کے محل میں جانے کے لیے بنا ہوا تھا ، لیکن صاف ظاہر ہے ۔ فرزانہ کو لانے والا محل میں تو نہیں جا سکتا تھا ۔ انھوں

نے اوپر کا رخ کیا ۔ زینہ ختم ہونے پر ایک برآمدہ نظر آیا ، اس کے دونوں طرف کمرے تھے ۔ برآمدہ سنسان پڑا تھا ، لیکن کسی وقت بھی کوئی دروازہ کھل سکتا تھا اور اس میں سے کوئی نکل سکتا تھا ، انھوں نے پروا نہ کی اور ایک ایک کمرے کے دروازے سے کان لگاتے اور تالے کے سوراخ میں سے اندر جھانکتے آگے بڑھنے لگے ۔ اور پھر ایک کمرے میں رسیوں سے بندھی فرزانہ انھیں نظر آ گئی ۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا ۔ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ انھوں نے دھک دے ڈالی اور پھر ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے ۔ کسی کے دروازے کی طرف آنے کی آہٹ ہوئی اور پھر دروازہ کھل گیا ۔ وہ دروازہ کھولنے والے کو دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے ۔

خوش آمدید انکسپکٹر صاحب ! ان کے کانوں سے ایک شوخ آواز ٹکرائی ۔ انھوں نے چونک کر اپنے سامنے دیکھا ۔ کمرے میں چار غونوار قسم کے آدمی موجود تھے ۔ وہ کرسیوں پر بیٹھے تھے ۔ اور فرزانہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی ۔ دروازہ کھولنے والے کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پستول نظر آیا ۔

”یہ سب کیا چکر ہے دوستو“  
”تمہیں اور تمہارے بچوں کو یہاں تک لانا تھا۔ بس اتنا ہی

بکھر ہے۔

• لیکن کیوں۔ ایسی کیا ضرورت پڑ گئی۔

• شاید تم ہمیں نہیں جانتے انپیکٹر جمشید۔

• ہو سکتا ہے، تم لوگ میک آپ میں ہو۔ اگر میک آپ ختم کر دو تو ضرور پہچان لوں گا۔

• ہاں، لیکن ہمارا ایسا کوئی پروگرام نہیں۔ ان میں سے ایک بولا۔

• ارے۔ تمہاری ٹانگ سے تو خون بہہ رہا ہے۔ اب تم کس طرح لڑ سکو گے۔ ان میں سے ایک اور بولا۔

• ہوں! تو تم لڑنے کا ارادہ بھی رکھتے ہو۔ انپیکٹر جمشید غرائے۔

• اگر تم نے لڑنے کی کوشش کی تو جواب تو دینا ہی پڑے گا۔

• بات ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ چاہتے کیا ہو؟

• بتا تو چکے ہیں۔ تم سب کو یہاں لانا تھا۔ ابھی دو رہتے ہیں، وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔

• کیا مطلب؟

• ہم نے جنگل میں جال کچھ اس طرح بچھایا تھا کہ تم لوگوں کے جال میں نہ آنے کا کوئی امکان نہیں تھا، اس لیے محمود اور

ناروق بھی بس آتے ہی ہوں گے۔

• اچھی بات ہے۔ تو پھر ہم ان کا انتظار کیے لیتے ہیں۔ اسے باندھے رکھنے کا اب کیا فائدہ۔

• ہاں، ضرور کیوں نہیں۔ چلو بھی۔ کھول دو اسے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

• یہ کیا بات ہوئی۔ کیوں کھول دیں۔ ہم اپنے لیے خطرات کیوں پیدا کریں۔

• وہ تو تم پیدا کر ہی چکے ہو۔ انپیکٹر جمشید تلخ انداز میں مسکرائے۔

• چلو۔ یونہی سہی، ہم ان میں اضافہ کیوں کریں۔

• اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

• نو۔ وہ آپہنچے۔ ہانی۔ دروازہ کھول دو۔ پستول والے سے کہا گیا۔

• اگر میں نے دروازہ کھولا تو انپیکٹر جمشید کو صدمہ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے اعتراض کیا۔

• تم فکر نہ کرو، پستول صرف تمہارے پاس نہیں ہے۔ ان اتفاق کے ساتھ ہی ان کے ہاتھوں میں بھی پستول نظر آئے۔

• ہانی نے مڑ کر دروازہ کھول دیا۔

• انھوں نے دیکھا۔ محمود اور ناروق تنکے تنکے انداز میں چلے



آ رہے تھے اور ان کے پیچھے تین آدمی تھے، ان کے ہاتھوں میں بھی پستول تھے :

”اوہو۔ آبا جان۔ آپ بھی یہاں موجود ہیں؟“

”تو اور کیا کرتا۔ جونہی مجھے معلوم ہوا کہ تم لوگوں کا پروگرام یہاں آنے کا ہے، میں بھی ادھر کے لیے پل پڑا۔ وہ مکرانے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”چلو جانی۔ اب باس کو فون کرو۔“

”اچھا! جانی نے کہا۔ اور کمرے میں رکھے فون کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک وہ دروازہ اندر سے بند کر چکا تھا۔

اس نے جلدی جلدی نمبر ملائے اور آخر بولا :

”ہیلو باس۔ وہ چاروں ہوٹل میں پہنچ چکے ہیں؟“ یہ کہہ کر

وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا اور پھر ریسیور رکھ دیا :

”باس نے شاباش دی ہے اور وہ خود یہاں پہنچ رہے ہیں۔“

”بہت خوب! یہ اور بھی اچھا ہے۔“ اُسی نے جواب دیا۔

”تم لوگوں نے اب تک بتایا نہیں کہ یہ چکر کیا ہے؟“

”باس آنے ہی والے ہیں۔ ان سے پوچھ لیں۔“ جانی نے

کہا۔

پانچ منٹ بعد ہی کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

جانی نے اشارہ ملنے پر دروازہ کھول دیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک دیو قامت آدمی اندر داخل ہوا :

”بہت خوب۔ سارا کام پروگرام کے مطابق ہو گیا نا۔“

”جی۔ جی ہاں۔ بالکل۔“

”پہلے تو مجھے تفصیل سناؤ۔ پھر میں بات کروں گا۔“

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کو یہاں تک لانے کے لیے جو کچھ کیا گیا تھا، وہ اسے بتایا گیا۔ آخر خاموش ہونے پر باس نے کہا :

”ویری گڈ۔ شاندار۔ مگر۔“

باس دھک سے رہ گیا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”کیا ہوا باس؟“ کمرے میں موجود لوگوں میں سے ایک نے کہا۔

”وہ۔ وہ کہاں ہے۔ جگہ۔“

”جی۔ کون وہ؟“ جگہ بولا۔

”جاکی۔ کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں تھا؟“ باس نے پریشان

آواز میں کہا۔

”نہج۔ جاکی۔ ارے۔ وہ کہاں رہ گیا؟“

”تم سب ایک دم احمق ہو۔ اس کا مطلب ہے، پروگرام میں

غرائی رہ گئی۔ اور اب ہم اس وقت تک اگلا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ جب تک کہ جاکی نہ لوٹ آئے۔

”اوہ۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔“

”انتظار کرو۔ اور جو بھی جاکی لوٹے، مجھے اطلاع دو۔ اب ان لوگوں کو باندھ لو۔ ان کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہ نکل سکے۔“

”اوکے سر۔ آپ فکر نہ کریں۔“ جنگو گہرائی ہوئی آواز میں بولا۔

اور باس باہر نکل گیا۔ جنگو نے سب پر ایک تھراؤد نظر ڈالی اور غرا کر بولا:

”جاکی کہاں رہ گیا؟“

”اس کی ڈیوٹی درخت پر تھی۔ درخت پر سے اس نے انپکڑ جمشید پر غور بھی کیا تھا۔ ہمارا تو یہی خیال تھا کہ وہ ہوٹل کا درخ کر چکا ہو گا اور یہاں پہنچ جائے گا، لیکن نہ جانے اس پر کیا ہوتی۔“ جانی بولا۔

”اب اگر وہ نہ لوٹا تو مصیبت آجائے گی۔ باس ہمیں کوئی انعام نہیں دے گا۔“

”یہ۔ یہ بُرا ہوا۔ کیوں نہ ہم یا کر اسے تلاش کریں۔“

”یہ اور بھی خطرناک ہو گا۔ ہمیں یہیں ٹھہر کر اس کا انتظار

کرنا ہو گا۔“

کمرے میں دو جھل سی خاموشی چھا گئی، پھر جنگو چونکا:

”اوہ ہاں۔ ہمیں تو ان لوگوں کو باندھنا ہی ہے۔“

”کوئی فائدہ نہیں۔“ انپکڑ جمشید چمک کر بولے۔

”کیا مطلب؟ وہ سب چونک اُٹھے۔“

”مطلب یہ کہ اب جاکی نہیں آئے گا اور تم لوگوں کو ہمیں

چھوڑنا پڑے گا۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ ہمیں فوراً چھوڑ دو۔ ورنہ

تم مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ ہو سکتا ہے جاکی کو پولیس لے

کر ادھر کا درخ کر رہی ہو۔“

”اوہ۔ وہ دھک سے رہ گئے، پھر جنگو چیخ کر بولا:

”جانی۔ تم ہوٹل کی پھت پر چڑھ جاؤ۔ اور چاروں طرف

نظر رکھو، اگر پولیس آتی نظر آئے تو فوراً اطلاع دیتا۔“

”اچھی بات ہے۔“ جانی نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ جنگو

کے ایک اور ساتھی نے اُٹھ کر دروازہ بند کیا۔

”اب بھی مجھے بتا دو۔ تم لوگ چاہتے کیا ہو؟“

”ہمیں نہیں معلوم۔ صرف باس کو معلوم ہے۔ کہ ان کا اگلا

قدم کیا ہو گا۔“

”اچھی بات ہے۔ تمہاری مرضی۔“

”قرضاد کو کیا ہوا تھا بھئی۔ یہ بے ہوش کیوں ہے؟“



"اس کے شانے پر سے گولی چھوٹی گزر گئی تھی۔ یہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہم آپ کو بلانے جھیل کے کنارے کی طرف بڑھے تو ہم پر بھی حملہ کیا گیا۔ درختوں پر سے دو آدمیوں نے بالکل بے خبری کے عالم میں ہم پر چلائیں لگائی تھیں، ہم سنبھل نہ سکے۔ اور آپ کی پینڈی میں کیا ہوا۔"

"اس میں بھی گولی لگی ہے۔ نہ جانے ان لوگوں کا پروگرام کیا ہے۔ وہ بولے۔

جنگو کے چار ساتھی دسیاں لے کر ان کی طرف بڑھے۔ محمود اور فاروق نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا، جیسے پوچھ رہے ہوں۔

"کیا خیال ہے آبا جان۔ کیا خود کو بندھوا لیں۔"

"ہاں بھئی۔ بندھوانا ہی ہو گا، کیونکہ خزانہ بے ہوش ہے۔"

انیکٹر جمشید بولے۔

اور ایک ایک کر کے انھیں باندھا جانے لگا۔ ابھی جنگو کے ساتھی اس کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی، جنگو نے ریسپورڈ اٹھایا اور بولا:

"سبس باس۔ جی۔ جی نہیں۔ وہ کم ہمت ابھی تک نہیں آیا۔"

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا، آخر ریسپورڈ

دکھ کر بولا:

"پلو بھئی۔ باس کا حکم ہے۔ اب ہمیں جنگل میں جا کر اسے تلاش کرنا ہو گا۔ جب تک اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو جاتا، کچھ نہیں کیا جائے گا۔"

"اور ان کا کیا کریں؟ ایک تے پوچھا۔

"باندھ تو چکے ہی ہیں۔ بس دروازہ بند کر کے چلے جاتے ہیں۔ اور ہاں جانی کو بھی چھت پر سے بلا لو۔"

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ جا چکے تھے۔ اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا جا چکا تھا۔ ان کے جانے کے ایک منٹ بعد انیکٹر جمشید بولے:

"محمود۔ اب اپنے جوتے کی ایڑی میں سے چاقو نکالنے کی کوشش شروع کر دو۔"

"مجھے افسوس ہے آبا جان۔ میں چاقو نہیں نکال سکتا۔ محمود نے مسمی صورت بنائی۔

"کیا مطلب۔ نکال کیوں نہیں سکتے۔ وہ حیران ہو کر بولے۔

"اس لیے کہ جب ہم پر چلائیں لگائی گئیں۔ تو چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ وہیں کہیں گر گیا تھا۔"

"اور؟ ان کے منہ سے نکلا۔

اور کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

## دلیسی طریقہ

”جاکی۔ کیا مطلب۔ یہ ریس والے گھوڑے دوڑاتا ہے۔“  
 خان رحمان حیران ہو کر بولے۔  
 ”نہیں۔ یہ بات نہیں۔ اس کا نام ہی جاکی ہے۔ یہ جرائم  
 کے گھوڑے دوڑاتا ہے۔ بہت پرانا کھلاڑی ہے۔ کئی بار  
 کا سزا یافتہ ہے، معاوضہ لے کر لوگوں کے مہمانہ کام انجام  
 دیتا ہے۔“  
 ”اوہ!“ ان کے منہ سے نکلا۔

”اُن تو جاکی۔ یہ سب کیا معاملہ ہے؟“  
 ”بھی۔ پتا نہیں۔ میں تو شکار کی غرض سے درخت پر  
 چڑھا تھا۔ ایک خرگوش پر میں نے گولی چلائی تھی۔ پھر اسے  
 پکڑنے کے لیے چھلانگ جو لگائی تو انہوں نے مجھ پر چھلانگ لگا  
 دی۔ ذرا ان سے پوچھیے۔ آخر میں نے کیا کیا تھا۔“  
 ”خان صاحب۔ آپ تفصیل سنائیں۔ اسے میں خود سیدھا کر

لوں گا۔“

انہوں نے جلدی جلدی ساری کہانی سنا ڈالی:  
 ”اوہو۔ یہ تو کوئی سوچا سمجھا منصوبہ جان پڑتا ہے۔ سُنو  
 جاکی۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ سب کچھ صاف صاف بتا  
 دو۔ ورنہ کمرہ امتحان کی سیر کرنا ہوگی۔“

”بتا کیا دوں۔ کوئی بات ہو تو بتاؤں بھی۔ میں کہہ چکا ہوں  
 کہ جنگل میں شکار کھیل رہا تھا کہ یہ صاحب مجھے پکڑ لائے۔“  
 ”ہوں۔ تم یوں نہیں مانو گے۔ اچھا جاکی۔ اب تم پر سختی  
 کرنا ہوگی۔“

”انسپکٹر صاحب۔ آپ کو مجھ پر سختی کرنے کا کوئی اختیار نہیں،  
 آپ کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔“  
 ”اچھا۔ میں جواب دے لوں گا۔“ اکرام نے ہنسا کر کہا، پھر  
 تھکن سے بولا:

”لے چلو بھی اے۔“  
 ”لیکن اکرام۔ ہم کیا کریں؟“  
 ”ہم سب جنگل میں ان کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اس شخص  
 - آسانی سے کچھ اگوانا ممکن نہیں۔ یہ کمرہ امتحان میں جا کر  
 ن بولے گا۔ یہ کام میرے ماتحت خود ہی کر لیں گے۔ میں بھی  
 آپ کے ساتھ ان کی تلاش میں نکلوں گا۔“



لیکن اس سے یہیں کیوں نہ اگھوانے کی کوشش کی جائے،  
فوج میں ہم غیر ملکی جاسوسوں کی زبان کھلوانے کے لیے ایک  
دہیسی طریقہ اختیار کرتے تھے۔ کیوں نہ اسے آزما کر دیکھ لیا  
جائے۔

اور وہ دہیسی طریقہ کیا ہے؟  
"چار چھوٹی چھوٹی لکڑیاں لے لیں۔ پتلی پتلی۔ خشک لکڑیاں۔  
اس کے دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملا کر ان لکڑیوں کو اس  
کی انگلیوں کے درمیان میں رکھ دیں اور پھر لکڑیوں کو دونوں  
ہاتھوں سے دبائیں۔ یہ چلا آٹھے گا۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔  
"میرا ایسا خیال نہیں۔"  
"تجربہ کر کے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟"

"اچھی بات ہے۔"  
"شائیں درختوں سے توڑی گئیں۔ جاکی کے ہاتھ ملائے گئے  
شائیں انگلیوں کے درمیان رکھی گئیں، پھر شاخوں کو زور سے دبا  
گیا۔ کچھ دیر تک تو جاکی ہونٹ بیسنے لگا، پھر چیخ اٹھا،  
"ارے ارے۔ میں۔ میں مرا۔" زکرو۔ نہ دیاؤ۔"  
"بدستور دباتے رہیں گے۔ جب تک تم یہ نہیں بتا دو گے

یہ کیا چکر ہے۔"  
"نہیں بتاؤں گا، کیونکہ اگر میں نے بتا دیا تو۔" وہ کہتے کہ

رک گیا۔

"تو کیا؟"

"ملک۔ کچھ نہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ بات ہے۔ چلو بھئی اور زور سے دباؤ۔"

"نہیں۔ نہیں۔" وہ چلا اٹھا۔ اور شاخوں پر اور زور لگایا

گیا۔ اب وہ تڑپ اٹھا اور اس نے چلا کر کہا:

"شہر۔ بتا ہوں۔"

"شہر میں گئے نہیں۔ پہلے بتا دو۔"

"وہ۔ وہ۔ ہوٹل شام لال کی دوسری منزل کے پہلے کمرے

میں ہیں۔" اس نے یک دم کہا۔

"لو بھئی اکرام۔ پتا چل گیا نا۔ اب اسے اپنے آدمیوں کے حوالے

کر دو۔ ہمیں فوری طور پر ہوٹل شام لال پہنچنا ہے۔ کیا تمہیں معلوم

ہے۔ یہ ہوٹل کہاں ہے؟"

"ہاں۔ اس جنگل کے دوسری طرف ایک سڑک نکلتی ہے۔ وہ

اس سڑک پر واقع ہے، لیکن ہم جنگل کی بجائے سڑک سے جائیں

گے۔ اس طرح ہمیں چکر مزدور پڑے گا، لیکن جنگل کی نسبت پھر

بھی جلدی پہنچیں گے۔ کیونکہ جنگل میں گاڑیوں کی رفتار بہت کم

رہے گی۔"

پھر وہ کو چھٹی دے دی گئی اور ان کا قافلہ ہوٹل کی طرف

دروازہ ہو گیا۔ پر وہ خیر داد، بچوں اور عورتوں کو لے کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کیونکہ تقریبی پروگرام کیس کی نذر ہو گیا تھا۔

آخر وہ ہوٹل شام دل پہنچے۔ ہوٹل کے مینجر کو ساتھ لے کر وہ دوسری منزل کے پہلے کمرے کے سامنے پہنچے۔ تالے کے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا تو ان کی باجیں کھل گئیں۔ احسن دوسری چابی سے دروازہ کھولا گیا اور وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ اس وقت تک انپیکٹر جمشید اپنی رسیاں کھول چکے تھے اور محمود کو کھول رہے تھے۔

”مبارک ہو جمشید۔ ہم پہنچ گئے۔“

”شکریہ۔ وہ مسکرائے۔“

رسیوں سے آنا دای کے بعد انپیکٹر جمشید ہوٹل کے مینجر کی طرف ٹھہرے:

”اس کمرے میں کون ٹھہرا ہوا ہے؟“

”سٹر جگونا می ایک آدمی۔“

”جگو! اکرام نے حیران ہو کر کہا، پھر وہ جلدی سے بولا:

”ہوں ٹھیک ہے۔ جاکی آج کل جگو کے ساتھ ہی کام کر

رہا ہے۔“

”اور میرا بھی ایک اندازہ سن لیں، لیکن نہیں۔ پہلے تو میں

ملاقات سنا دوں۔“

یہ کہہ کر انھوں نے پوری تفصیل سنائی، پھر بولے:

”اب میرا اندازہ یہ ہے کہ باس بھی اسی ہوٹل کے کسی کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے، کیونکہ وہ فون کرنے کے صرف پانچ منٹ بعد یہاں آ گیا تھا۔“

”اوہ! تب تو اسے گرفتار کرنا بہت آسان ہے۔ ہوٹل کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں اور ایک ایک آدمی کو چیک کر لیا جائے۔“

اکرام بولا۔

”لیکن بظاہر! اس طرح تو میرے ہوٹل کی بہت بدنامی ہوگی۔“

مینجر نے پریشان ہو کر کہا۔

”خیر۔ ہم ہر بیرونی دروازے پر سادہ لباس والے مقرر کر دیتے ہیں اور ایک ایک کمرے کے مقیم کو ایک ایک نظر دیکھ لیتے ہیں، اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ انپیکٹر جمشید نے تجویز پیش کی۔“

”جی نہیں۔ ایسا آپ شوق سے کر سکتے ہیں۔ مینجر نے کہا۔“

اس ترکیب پر عمل شروع کیا گیا۔ اکرام نے سادہ لباس والوں کو فون کیا۔ انتظامات مکمل ہونے کے بعد ایک ایک کمرے میں ٹھہرے لوگوں کو دستک دے کر دروازے کھولنے پر مجبور کیا گیا۔ لوگ بہت حیران اور پریشان تھے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ اس کام میں قریباً دو گھنٹے لگے، لیکن وہ شخص نظر نہ آیا جو باس کے طور پر کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”یہ کیا ہوا سر۔“



”شاید وہ پہلے ہی ہوٹل سے جا چکا ہوگا“ محمود بولا۔

اس وقت تک انپیکٹر جمشید اور فرزاد کی مرہم پٹی کی جاچکی تھی اور فرزاد بھی اب ہوش میں تھی، تاہم اسے ٹا دیا گیا تھا۔  
”نہیں۔ وہ ہوٹل میں ہی موجود ہے، لیکن شاید اس نے اپنا منہ تبدیل کر لیا ہے۔ میں ایک بار پھر سے ہوٹل کا جائزہ لوں گا۔“ انھوں نے کہا۔

”جی کیا فرمایا۔ ایک بار پھر۔ اس طرح تو لوگ بہت پریشان ہوں گے۔“

”ہم بھی تو بہت پریشان ہو رہے ہیں۔“

”بیسے آپ کی مرضی؟ اس نے کندھے اچکائے۔

”آپ نے جرائم پیشہ لوگوں کو ہوٹل میں ٹھہرایا ہوا کیوں تھا۔“  
انپیکٹر جمشید نے برا سامنہ بنایا۔

”جی۔ میں نے۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ لوگ جرائم پیشہ ہیں۔“ اس نے گڑ بڑا کر کہا۔

”آپ یہ ہوٹل کب سے چلا رہے ہیں؟“

”بہت عرصے سے۔“

”آپ اس کے صرت میئر ہیں یا مالک بھی ہیں؟“

”میں ہی اس کا مالک ہوں۔“ اس نے کہا۔

”لیکن آبا جان۔ آپ ان کی ذات کے بارے میں سوالات کیوں

کرتے گئے۔ ہمارا مسد تو اس وقت باس کی تلاش ہے۔“ فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”کبھی کبھی میرا جی دماغ چل جاتا ہے۔ تم کچھ خیال نہ کرو۔  
اں تو میئر صاحب۔ تو یہ ہوٹل آپ کا ہے۔“

”جی اں بالکل۔“

”آپ نے اسے خود بنوایا تھا؟“

”جی نہیں۔ خریدا تھا۔“

”کس سے؟“

”ہوٹل کے پہلے مالک کا نام گردھاری مل تھا۔ یہ ہوٹل

میں نے اس سے خریدا تھا۔“

”بہت خوب۔ تو گردھاری مل آپ کو یہ ہوٹل بیچ گیا تھا۔“

”آپ کے پاس کاغذات تو ہوں گے اس کی خریداری کے۔“

”جی اں۔ کیوں نہیں؟“

”اور گردھاری مل کدھر گیا؟“

”جی۔ وہ اس ملک سے چلا گیا تھا۔ اس نے کسی دوسرے

ملک میں کوئی کاروبار شروع کر لیا تھا۔“

”اور یہ آج سے کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟“

”قریباً تین سال پہلے کی۔“ اس نے بتایا۔

”گویا آپ تین سال سے اس کے مالک چلے آ رہے ہیں۔“

”ہاں۔ یہی بات ہے۔“

”لیکن میرا خیال اور ہے۔“ اپناک انپکڑ جھینڈ بولے۔

”آپ کا خیال اور ہے۔ کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھا۔ آپ کیا

کہنا چاہتے ہیں۔“

”میرا خیال یہ ہے کہ آپ ہی وہ باس ہیں۔ جسے ہم تلاش

کر رہے ہیں۔“

”کیا!؟“ وہ سب چلا آئے۔

مینجر اچھل پڑا اور پھر اس نے نکل بھاگنے کے لیے ایک لمبی

چھلانگ لگا دی، لیکن محمود اس سے پہلے چھلانگ لگا چکا تھا۔

نتیجہ یہ کہ دونوں الجھ کر دھڑام سے گرے۔

”بھئی ذرا سنبھل کر۔ تم لوگوں کو تو گرنے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔“

فادوق شوخ لہجے میں بولا۔

## اس بات کو چھوڑیں

سادہ لباس والوں نے مینجر کو جکڑ لیا۔

”تو وہ باس ہی شخص ہے۔“

”ہاں! یہ اپنی آواز اور لہجے پر پوری طرح قابو نہیں رکھ سکا۔“

انپکڑ جھینڈ مسکرائے۔

”لیکن اسے ہم سب کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟“ قمرزاد

حیران ہو کر بولی۔

”یہ تو یہی بتائے گا۔ لیکن نہیں۔ ٹھہرو۔ مجھے حیرت تو

اس بات پر ہے کہ ہم تو پروگرام کے بغیر جیل کے کنارے پہنچ

گئے تھے۔ لیکن ان کا پروگرام سوچا سمجھا پروگرام تھا، پھر آخر

یہ لوگ یہاں پہلے سے کس طرح موجود تھے۔ یا یہ کہ انہیں کس طرح

معلوم ہو گیا تھا کہ ہم یہاں ضرور آئیں گے۔“

”واقعی۔ یہ بہت حیران کن بات ہے۔“

”مستر مینجر۔ کیا تم بتاؤ گے کہ یہ سب کیا ہے۔“



”افسوس! میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“ اس نے کہا۔

”اگر تم کچھ نہیں بتاؤ گے تو ہم دوسرا طریقہ اختیار کریں گے، اور تمہیں ۷ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ دوسرا طریقہ دوسرا ہی ہوتا ہے، پہلا نہیں۔“ فاروق بولا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ محمود بتا کر بولا۔

”چتا نہیں۔ آبا جان۔ آپ کیا کہتے ہیں۔“ فاروق ان کی طرف مڑا۔

”ہمیں اس کی زبان کھلوانا ہوگی، لیکن اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے اس ہوٹل کی اچھی طرح تلاشی لیں۔ یہ حضرت اس قسم کے اور بھی نہ جانے کتنے کارنامے انجام دے چکا ہوگا۔“

”جی ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔“

”اس کا خیال رکھنا۔ بھاگنے نہ پائے، ہم ہوٹل کی اینٹ سے اینٹ بجا کر ابھی آتے ہیں۔“ اکرام بولا۔

”بھئی واہ! اب تو انکل اکرام بھی محاورات کا استعمال کرنے لگے۔“ فاروق خوش ہو کر بولا۔

”تم لوگوں کی صحبت میں رہ کر جو نہ ہو جائے، کم ہے۔“

خان رحمان بولے۔

اور وہ مسکرا دیے، ہوٹل کی تلاشی شروع ہوئی۔ رخصت

ہونے سے پہلے انپکڑ جمید بولے :

”بھئی تہہ خانے کے امکان کا بھی خیال رکھنا۔ ایسے لوگ تہہ خانے ضرور بنواتے ہیں۔“

”جی ہسترا! محمود بولا۔

”ہم تو پھر تو یہی تہہ خانے کی تلاش پر دیں گے۔“ فرزانہ نے کہا۔

آدھ گھنٹے کی محنت کے بعد محمود، فاروق اور فرزانہ نے آکر بتایا :

”آبا جان! مبارک ہو، ہم نے ایک عدد تہہ خانہ تلاش کر لیا ہے۔“

”دیری گڈ! یہ ہوا ہے کام۔“ اوچلیں۔ انھوں نے خوش ہو کر کہا۔

وہ سب تہہ خانے میں اترے۔ گندی ہوا کے خارج ہونے کا انتظار کر لیا گیا تھا۔ گیس لیمپ کی روشنی کا انتظام بھی کر لیا گیا تھا۔ ایک ایک سیڑھی اترتے وہ تہہ خانے کے فرش پر پہنچ گئے۔

تہہ خانے میں مختلف قسم کی پیڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کچھ خالی پیٹیاں بھی دکھی تھیں۔ فرش پکڑا تھا، ایک جگہ انپکڑ جمید کے قدم رک گئے اور انھوں نے دوتین بار آچھل کود

کر دیکھا :

" درزش کر رہے ہیں آبا جان ؟ فادوق حیران ہو کر بولا ۔  
" نہیں ، اس جگہ زمین قدرے نرم محسوس ہوتی ہے ۔ " انھوں  
نے کہا ۔

" ادوہ ! یہ تو بہت خطرناک بات ہے "۔

" ہاں ! بھئی اکرام ، اس جگہ کو کھود کر دیکھنا ہی ہو گا "۔

" جی ہسٹر ! " اس نے کہا اور اوپر چلا گیا ۔

کھدائی شروع کی گئی ۔ اور جب قریباً ڈیڑھ میٹر گرا گڑھا کھد  
گیا تو ایک کدال کسی سخت چیز سے ٹکرائی ، سادہ لباس والے  
کے مزے مارے خوف کے نکلا :

" ارے ! یہ کیا "۔

سب گڑھے پر جھک گئے ، اب مٹی ہاتھوں سے ہٹائی گئی ،  
اور یہ دیکھ کر وہ تھرا اُٹھے کہ گڑھے میں ایک انسانی جسم موجود  
تھا ۔

" مینجر کو یہیں لے آؤ " انپکٹر جمشید نے بھرائی ہوئی آواز میں  
کہا ۔

" یہ ۔ یہ کون ہے آبا جان ؟ "

" گردھاری مل ! " انھوں نے کہا ۔

" کیا ! " وہ ایک ساتھ چلا اُٹھے ۔

اکرام کے آدمی مینجر کو لے آئے ، اس کا چہرہ پہلے ہی دھواں  
ہو رہا تھا ، شاید سادہ لباس والوں نے اسے بتا دیا تھا کہ تہہ خانے  
میں ایک دفن شدہ لاش ملی ہے ۔  
" ہاں تو مٹر مینجر ۔ یہ کس کی لاش ہے "۔

" م ۔ میں کیا جانوں " اس نے کاپیتی آواز میں کہا ۔

" اب انکار کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا ، کیونکہ لاش کا پوسٹ مارٹم  
کیا جائے گا ، ماہرین یہ تک معلوم کر لیں گے کہ اسے کتنا عرصہ  
پہلے قتل کیا گیا تھا ۔ پھر ہم یہ بھی معلوم کر لیں گے کہ یہ ہے  
کون ۔ لہذا چھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا ۔ کیا یہ شخص گردھاری  
مل نہیں ہے "۔

" ہاں ! " اس نے کھوٹے کھوٹے انداز میں کہا ، انہیں یوں لگا کہ  
جیسے اس کی آواز کسی اندھے کنوئیں سے آئی ہو ۔

" تو تم نے ہوٹل پر قبضہ کرنے کے لیے اسے ہلاک کر دیا تھا ،  
اور اس جرم کا پتا شاید اس لیے نہیں لگا کہ گردھاری مل کا  
اگے پیچھے کوئی نہیں ہو گا "۔

" جی ہاں ! یہی بات ہے ۔ گردھاری مل کے ہوتے ہوئے

بھی میں اس ہوٹل کا مینجر تھا ۔ ایک روز میں نے سوچا ، اگر میں  
اسے ٹھکانے لگا دوں تو پورے ہوٹل کا مالک بن سکتا ہوں ۔  
چنانچہ میں یہ کام کر گزرا اور مشہور کر دیا کہ گردھاری مل ہوٹل



فروخت کر کے دوسرے ملک چلے گئے ہیں۔ اس بات پر کسی کو بھی شک نہیں ہوا، کیونکہ گردھاری مل کی زندگی میں ہی میں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اس ملک سے چلے جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اس قسم کی باتیں سن سن کر اس نے بھی لوگوں کے سامنے کہنا شروع کر دیا کہ ہاں۔ اس کا ارادہ ہے کہ باہر چلا جائے۔

”خیر۔ یہ تو ہوا۔ لیکن تمہیں یہ کس طرح پتا چل گیا تھا کہ ہم آج سنہری جھیل جا رہے ہیں۔“

”جو شخص مجھ سے یہ کام لے رہا ہے، اس نے بتایا تھا کہ آپ لوگ آج سنہری جھیل جا رہے ہیں۔ وہیں ہم اپنا کام کر سکیں گے۔“

”کیا مطلب۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”آپ لوگوں کو اغوا میں نے اپنی خواہش یا کسی ضرورت کے تحت نہیں کیا۔ کوئی دوسرا یہ چاہتا تھا کہ آپ سب کو ٹھکانے لگا دیا جائے، اسی لیے میں نے اپنے آدمیوں کے ذریعے آپ لوگوں کو اغوا کرا لیا۔“ اس نے کہا۔

”لیکن کیوں۔ ٹھکانے لگانے کا کام تو جنگل میں زیادہ آسانی سے ہو سکتا تھا۔“

”جی نہیں۔ وہاں لاشیں ٹھکانے لگانے کا مسئلہ پیدا ہوتا،

جب کہ ہوٹل میں میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔“  
”تو یہ اطلاع اسی نے تمہیں دی تھی کہ ہم لوگ آج سنہری جھیل کا رخ کریں گے۔“  
”ہاں! جو نہی مجھے یہ اطلاع ملی، میں نے پروگرام ترتیب دے ڈالا۔“

انسپکٹر جمشید یک دم خان رحمان کی طرف گھوم گئے:

”خان رحمان! یہ ہم کیا سن رہے ہیں۔“

”میں خود حیران ہوں۔ میں نے اس پروگرام کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔“

”کیا سنہری جھیل کی طرف آنے کا پروگرام تمہارا پہلے سے تھا۔“

”ہاں! میں کئی دن سے سوچ رہا تھا اور پھر کھانا وغیرہ تیار

کرانے کے سلسلے میں ظہور وغیرہ سے بھی بات چیت ہوئی تھی، ان میں سے کسی نے کسی سے ذکر کر دیا ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔“

”خیر۔ ان سے بھی پوچھ لیں گے۔“ انہوں نے کہا اور پھر مینجر کی طرف مڑے:

”وہ کون ہے، جس نے تمہیں اس کام پر مامور کیا تھا۔“

”میں نہیں جانتا، اس نے مجھ سے فون پر رابطہ قائم کیا تھا

اور میرا معاوضہ بذریعہ ڈاک بھیجا تھا۔“

”اور وہ کیا چاہتا تھا۔ صرف اتنا کہ ہمیں ٹھکانے لگا دیا

جائے۔

”ہاں! صرف آپ چاروں کو کسی اور کے بارے میں اس نے نہیں کہا تھا۔“

”ہوں! گویا مطلب یہ ہوا کہ کوئی نا معلوم شخص ہم چاروں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے بُری طرح بے چین ہے، اس نے یہ کام میسجر کے ذریعے لینا چاہا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ میسجر صاحب تم اس قسم کے کام اکثر کرتے رہتے ہو اور اس آدمی کو تمہارے بارے میں اچھی طرح معلوم تھا۔ اگر معلوم نہ ہوتا تو وہ یہ کام تم سے کس طرح لے سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے، کسی ایسے آدمی نے اس نا معلوم آدمی کو تمہارے بارے میں بتایا ہو جس نے تم سے کوئی کام لیا ہو گا۔ خیر۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی شخص شہر میں ایسا موجود ہے جو ہمیں زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیا خیال ہے تمہارا۔“

”جی ہاں! یہی بات ہے۔“ میسجر فوراً بولا۔

”اور وہ آدمی کون ہے؟“ انہوں نے یک دم کہا۔

”افسوس! میں نہیں جانتا۔“

”ہوں۔ اس نے تمہیں کتنی رقم بذریعہ ڈاک بھیجی تھی۔“

”دس ہزار روپے۔ میں ایسے کاموں کے پچاس ہزار روپے لیتا

ہوں۔“

”اور یہ بات اسے کس نے بتائی؟“

”پتا نہیں۔ میں خود حیران ہوں۔“

”اکرام! مجھے ایک جگہ جانا ہے۔ سب لوگ یہیں موجود رہیں گے، ابھی یہ خبر نہیں اڑنی چاہیے کہ ہوٹل شام لال کے میسجر کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”آپ۔ کہاں جا رہے ہیں؟ فرزانہ بے چین ہو کر بولی۔

”ایک جگہ۔ بہت ضروری کام ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ایک گھنٹے تک لوٹ آؤں گا۔“

”تو ہم تینوں بھی یہیں رہیں گے۔“ محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

”ہاں! میں تنہا ہی جا سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے کوئی چیز نکالی اور تہ خانے کی میزٹیوں کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ جب وہ ہوٹل سے باہر نکلے تو ان کا چہرہ تبدیل ہو چکا تھا۔ اور انہیں کوئی آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا۔ انہوں نے ہوٹل کے باہر کھڑی اپنی کار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ان کی کار اکرام وغیرہ لے آئے تھے۔ پندرہ منٹ بعد وہ ٹیکسی سے اترے اور ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ جلد ہی دروازہ کھل گیا اور ایک بوڑھے آدمی کا چہرہ دکھائی دیا۔

”کیا بات ہے؟“



”مجھے کچھ معلومات کی ضرورت ہے۔“  
 ”میرا پتا کس نے بتایا؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”اس بات کو چھوڑیں، معلومات مل سکیں گی یا نہیں، معاوضہ  
 معقول ملے گا۔“

”اچھا۔ اندر آ جاؤ۔“  
 وہ اس کے پیچھے چلتے ایک گندے سے کمرے میں داخل ہوئے  
 اور کرسی پر بیٹھ گئے۔  
 ”ہاں! اب بتاؤ۔ کس قسم کی معلومات درکار ہیں؟“  
 ”شہر میں کوئی ایسا آدمی ہے۔ جو کچھ لوگوں کو ٹھکانے لگا  
 سکے۔“

”اوہ! یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔“ بوڑھے نے کانپ کر کہا۔  
 ”تو شہر میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے۔“ انھوں نے مایوسانہ انداز  
 میں کہا اور اٹھنے لگے۔

”ارے ارے۔ آپ اٹھ کیوں رہے ہیں، میں نے کب کہا  
 ہے کہ ایسا آدمی نہیں ہے۔“  
 ”تو ایسا کوئی آدمی موجود ہے۔ بہت خوب۔ تب تو میں  
 ضرور بیٹھوں گا۔“

”کیا تمہیں کچھ لوگوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔“  
 ”آپ اس بات کو چھوڑیں۔ اس آدمی کے بارے میں بتائیں۔“

”میرا گھر ایک طرح کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جرائم کا انسائیکلو پیڈیا،  
 گھروں کے بارے میں ایک ایک تفصیل مل سکتی ہے۔ لیکن پیسے  
 بہت خرچ کرنا پڑتے ہیں، کیونکہ مجھے پولیس والوں کو بھی تو خوش  
 رکھنا پڑتا ہے۔ اگر انہیں ان کا حصہ نہ ملے تو مجھے سلاخوں کے نیچے  
 ڈال دیں۔ ہاں تو پہلے معاوضہ نکالیں۔ صرف پانچ ہزار روپے۔“  
 انسپکٹر جمشید نے بٹوہ نکالا اور اس میں سے پانچ ہزار روپے  
 نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔

”تمہارا کام ہوٹل شام لال کا مینجر کر دے گا۔ اس سے مل  
 کر معاملہ طے کر لو۔ میرا نام لے دینا، پھر وہ تم سے کوئی سوال  
 نہیں کرے گا۔“

”شکریہ۔ کیا آپ نے کسی اور کو بھی مینجر کا نام بتایا ہے؟“  
 انھوں نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔  
 ”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر بولا۔

”میں اس لیے پوچھ رہا ہوں، کہیں ہوٹل شام لال کا مینجر اس  
 کے کام میں نہ الجھا ہوا ہو۔“

”اس کے پاس کام کرنے والے بہت آدمی ہیں، وہ ایک  
 وقت میں کئی آدمیوں کا کام نبٹا سکتا ہے۔“

”اچھی بات ہے۔“ انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا، پھر رُک  
 کر بولے :

”یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہاں کوئی بھی آکر آپ سے معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ کیا آپ کو خوف محسوس نہیں ہوتا۔ کوئی غلط آدمی بھی تو آپ تک پہنچ سکتا ہے۔“

”نہیں! مجھ تک کوئی غلط آدمی نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ میں نے کچھ اشارے قائم کر رکھے ہیں۔ جب میں پوچھتا ہوں، آپ کو کس نے بھیجا ہے تو دوسرا جواب میں یہ کہتا ہے، اس بات کو چھوڑیں۔ اور میں جان لیتا ہوں کہ اسے میرے کسی واقف کار سے ہی بھیجا ہے۔ اور بھی ہر قسم کے معاطلات میں میں مدد کر سکتا ہوں۔“

”اچھا تو کیا آپ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ ان دنوں جیراج کہاں ہے؟“

”کیا!!!“ بوڑھا اچھل پڑا۔ اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیلتی چلی گئیں۔

## موت کا خواہش مند

”کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔ کیا میں نے کوئی بہت غلط بات پوچھ لی۔“ انپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

”آپ۔ آپ۔ جیراج کو کس طرح جانتے ہیں۔“

”کسی زمانے میں میرا اس سے کچھ تعلق تھا، پھر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا اور آج تک اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔“

”آپ کا اس سے کوئی تعلق تھا۔ آپ کا نام کیا ہے؟“

”کیا مجھے پھر یہی کہنا چاہیے کہ اس بات کو چھوڑیں۔“ انپکٹر جمشید مسکراتے۔

”نہیں! اب آپ کو نام بتانا چاہیے۔“ بوڑھا زبردستی مسکرایا۔

”تو پھر میرا نام انپکٹر جمشید ہے۔“

”نہیں!!! اس بار وہ اس قدر زور سے اچھلا کہ کرسی الٹ گئی۔ اس کے بدن میں تھر تھری دوڑ گئی۔

”اوہو۔ ایسی بھی کیا گھبراہٹ۔ جرم کرنے والوں کو اس دن



کا انتظار تو رہتا ہی چاہیے۔ جب ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگنی ہوتی ہیں۔ آخر مجرم کب تک بیچ سکتا ہے۔ مسٹر جیراج۔

کمرے میں موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ بوڑھے جیراج کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا، آخر انپیکٹر جمشید ہی بولے :

”اب تم حیران ہو رہے ہو گے۔ کہ میں یہاں کس طرح پہنچ گیا۔ بھئی میں تو دراصل جیراج سے ہی ملنے آیا تھا، لیکن یہاں نظر آیا ایک بوڑھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک مدت پہلے یہ تمہارا گھر تھا۔ اور تم اس قسم کے کام انجام دیتے تھے، یعنی مجرمانہ معلومات دوسروں کو فروخت کرتے تھے۔ جرائم کی دنیا سے معلومات حاصل کرنے کے لیے لوگ تمہارے پاس آتے تھے۔ پھر تمہارے اس خطرناک کاروبار کا علم مجھے ہو گیا۔ میں نے تمہیں گرفتار کر لیا، لیکن تم حوالات سے بھاگ نکلے۔ اس کے بعد تمہارا کوئی پتا نہ چل سکا۔ یہ مکان تم نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس کے مالک نے پھر یہ مکان ایک بوڑھے کو دے دیا۔ یہ خبر مجھے اپنے ایک ماتحت کے ذریعے ملی تھی۔ کاش میں نے اسی وقت آکر بوڑھے کو دیکھ لیا ہوتا۔ آج جب ہوٹل شام لال کے مینجر نے یہ ذکر کیا کہ اس سے ہمارے قتل کا کام کسی نامعلوم آدمی نے لینا چاہا ہے اور اس نامعلوم آدمی کو مینجر کا پتا کس طرح لگا۔ یہ مینجر کو بھی معلوم نہیں، تو مجھے تم یاد آگئے۔ اچانک میں

نے محسوس کیا۔ کہیں تم اپنے اس مکان میں تو موجود نہیں۔ یعنی بوڑھے کے روپ میں۔ بس میں یہی دیکھنے چلا آیا تھا۔ دیکھا تم نے میرا اندازہ کس قدر درست نکلا، اب تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ ہمارے قتل کے سلسلے میں مینجر کا پتا تم نے کس شخص کو دیا تھا اور وہ تمہارے پاس پہنچ کس طرح گیا۔

”اس بات پر تو خود مجھے بھی حیرت ہے کہ وہ میرے پاس کس طرح پہنچ گیا تھا۔“

”کیا مطلب۔ یہ کیا بات ہوئی۔ بھلا تمہیں کیوں معلوم نہیں۔“

”وہ کوئی غیر ملکی آدمی تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے آکر بس یہی پوچھا تھا کہ شہر میں ایسا کون آدمی موجود ہے جو کچھ لوگوں کو ٹھکانے لگا سکے۔ میں نے اپنے اطمینان کے لیے اس سے سوالات کیے اور پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ اسے ضرور میرے کسی واقف نے بھیجا ہے، چنانچہ میں نے اپنا معاوضہ لے کر مینجر کا پتا بتا دیا اور اس نے مینجر سے معاملہ طے کر لیا ہو گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔ وہ آپ کو ختم کرانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ کہہ کر جیراج خاموش ہو گیا۔

”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے معلوم ہوتا تو اسے مینجر کا پتا نہ بتاتے۔ حالانکہ میرا خیال ہے، تم اور بھی خوش ہو کر اسے پتا بتا دیتے۔ اب صرف یہ بتاؤ کہ اس غیر ملکی کا حلیہ کیا تھا۔“

”خلیلہ۔ وہ سرخ و سفید رنگ کا بے قد کا آدمی تھا۔ ناک پکڑے جیسی، آنکھیں بالکل نیلی۔ جسم پتلا دبلا، لیکن مضبوط تھا۔“  
 ”اس نے اپنا کوئی نام تو بتایا ہوگا۔“  
 ”نہیں۔ کوئی نام نہیں بتایا تھا۔ نہ میں نام پوچھا کرتا ہوں۔“  
 ”پھر۔ اب کیا خیال ہے۔ میرے ساتھ حوالات چل رہے ہو یا دنگا فساد کرنے کا ارادہ ہے۔“  
 ”کیا آپ مجھے چھوڑ نہیں سکتے۔“  
 ”تمہیں چھوڑ دوں۔ لیکن کیوں۔ کیا تم نیک کام کرتے رہے ہو۔“  
 انھوں نے حیران ہو کر کہا۔  
 ”میں۔ میں آپ کو ایک لاکھ روپے دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”بہت خوب۔ تو اب انپکٹر جمشید کو بھی رشوت پیش کی جائے گی۔ شاید تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے، ورنہ یہ بات کبھی نہ کہتے۔ تم ایک کروڑ روپے بھی رشوت دو تو بھی میں تمہیں حوالات پہنچا کر دم لوں گا۔ اب اٹھو اور میرے آگے چلتے ہوئے باہر نکلو۔“

”کک۔ کیا آپ۔ واقعی۔“

”چلو بھئی۔ تمہیں سزا دینے یا معاف کرنے کا اختیار صرف عدالت کو ہے۔“

وہ اسے لیے باہر نکل آئے اور حوالات پہنچا کر پھر ہوٹل پہنچے، مینجر بت بنا بیٹھا تھا۔ انھیں آتے دیکھ کر محمود بے چین ہو کر بولا:  
 ”آپ کہاں گئے تھے آبا جان؟“  
 ”جیراج کو گرفتار کرنے۔“ انھوں نے کہا۔  
 ”جی۔ کیا مطلب؟ اکرام اچھل پڑا۔“  
 اور انھوں نے تفصیل سنا دی۔ مینجر بھی دھک سے رہ گیا، پھر اسے بھی حوالات میں بھیج دیا گیا اور اس کے آدمیوں کی تلاش میں سادہ لباس والے ادھر ادھر روانہ کر دیے گئے۔  
 ”خان رحمان۔ میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔“  
 ”م۔ میرا گھر، لیکن میرا گھر تو تم نے ہزاروں بار دیکھا ہوا ہے۔“

”ہاں، لیکن ایک بار اور دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ مسکراتے۔  
 ”بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آؤ چلیں۔“  
 ”آپ سمجھے نہیں انکل۔ آبا جان موجودہ واردات کے سلسلے میں آپ کے گھر کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔“ محمود مسکرایا۔  
 ”اوہ، تو یہ بات ہے۔ ضرور ضرور۔ کیوں نہیں؟“ انھوں نے خوش ہو کر کہا، پھر چونک کر بولے:  
 ”کک۔ کیا تم مجھ پر شک کر رہے ہو جمشید؟“  
 ”تو ب۔ بھلا تم پر شک کس سلسلے میں۔ میرا دماغ چل گیا۔“



ہے کہ تم پر شک کروں ؟  
 "خیر۔ پولیس انپیکٹر ہونے کی حیثیت سے شک تو تم کر سکتے ہو۔" خان رحمان مسکرائے۔

"میں اس بات پر حیران ہوں خان رحمان۔ کہ مجرموں کو یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی کہ تم ہم سب کو لے کر سنہری جھیل جانے کا پروگرام بنا چکے ہو۔ اور وہ بھی ویران کنارے کی طرف۔"

"ہاں ! یہ بات واقعی بہت عجیب ہے۔" وہ بڑبڑائے۔  
 "دیے ان دنوں کسی قسم کی مرمت کے لیے تو کوئی تمہارے ہاں نہیں آیا تھا۔"  
 "نہیں۔ کسی قسم کی مرمت نہیں کرائی گئی۔ ہاں کارپوریشن کے دو آدمی جراثیم کش دوا چھڑکنے ضرور آئے تھے۔"  
 "اور کیا انہیں تم نے خود بلایا تھا۔"

"نہیں۔ وہ خود ہی آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ انہیں محکمے کی طرف سے حکم ملا ہے۔ تمام گھروں میں دوا چھڑکیں۔"  
 "ہوں۔ تب تو ضرور وہی کوئی گڑبڑ کر گئے ہیں۔"  
 "گڑبڑ۔ کیسی گڑبڑ۔" انہوں نے بوکھلا کر کہا۔  
 "ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔"

آخر وہ خان رحمان کی کوشی میں داخل ہوئے اور ایک

ایک چیز کا جائزہ لیا گیا۔ خان رحمان کے کمرے میں میز کے نیچے جھتے میں انہیں ایک سیاہ رنگ کا بٹن سا لگا ہوا نظر آیا :  
 "بس یہی ہے وہ۔ جس کے ذریعے یہاں کی آوازیں باہر کچھ فاصلے پر سُنی جاتی رہی ہیں۔ وہ کارپوریشن والے یہی بٹن لگانے آئے تھے۔ اور اس قسم کے بٹن پروفیسر صاحب اور ہمارے گھر میں بھی لگے ہوں گے۔"

"اوہ ! ان کے منہ سے نکلا۔"

وہاں سے وہ اپنے گھر پہنچے۔

"کیوں بیگم۔ چند دن پہلے کارپوریشن کے دو آدمی دوا چھڑکنے تو نہیں آئے تھے؟"

"ہاں بالکل۔ ضرور آئے تھے۔ کیوں کیا بات ہے۔" وہ حیران ہو کر بولیں۔

"ایسے دو آدمی تو میرے ہاں بھی آئے تھے۔" پروفیسر دادو

بول اٹھے۔

"دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا۔ یہاں جو بٹن نظر آئے، اسے چھونا مت، شاید اس پر آنکلیوں کے نشانات ہوں۔"

"کیا معاملہ ہے جمشید؟"

اور وہ انہیں معاملہ بتانے لگے۔ پانچ منٹ بعد انہوں نے بٹن تلاش کر لیا۔ یہ محمود، فاروق اور فرزانہ کے کمرے میں موجود



تھا، پھر یہ لوگ پروفیسر صاحب کے ہاں گئے اور وہاں بھی بیٹن تلاش کر لیا گیا۔ ان پر سے انٹیکلوں کے نشانات بھی اٹھوا لیے گئے۔

”سب حالات سب لوگوں کے سامنے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں۔“ انپکٹر جمشید بولے۔ اب سب لوگ پروفیسر داؤد کی توجہ گاہ میں موجود تھے۔

”آپ کا اشارہ اس غیر ملکی کی طرف ہے؟“ فرزانہ نے پوچھا۔  
”ہاں۔ بالکل۔“

”ہوائی سروس سے دارالحکومت میں آنے والے غیر ملکیوں کی فہرست طلب کر لیں۔ ان سب کی جو ایک ہفتے کے اندر اندر ہمارے ملک کے اندر آئے ہیں۔ اور ان کی چیکنگ شروع کر دیں۔“ فرزانہ نے کہا۔

”بھئی بہت خوب! نہایت مناسب ترکیب ہے۔“ انپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

”وہ تو غیر ہونا ہی تھی۔ بتانے والی جو فرزانہ ہے۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”لیکن آبا جان۔ ان کی تعداد تو بہت زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔“  
”تو کیا ہوا۔ ہم یہ کام خود بھی کریں گے اور اکرام اور اس کے ماتحتوں سے بھی کرائیں گے۔ اس کے سوا کوئی اور ترکیب ہے

بھی تو نہیں۔ اور ادھر ہوٹل شام لال کے میجر کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں شائع نہیں ہونے دیں گے۔ تاکہ وہ غیر ملکی اپنی جگہ آرام سے بیٹھا رہے۔“

”ایک اندازہ تو میں بھی لگا سکتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ وہ غیر ملکی ضرور کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔“ فاروق بولا۔  
”یہ اندازہ تو ایک احمق بھی لگا سکتا ہے۔“ فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تو لگا لو تا۔ تمہیں کس نے روکا ہے۔“ فاروق بولا، پروفیسر داؤد اور خان رحمان ہنس پڑے۔

انپکٹر جمشید فون پر جھک گئے اور ہوائی سروس کے دفتر سے بات کرنے لگے۔ ایک گھنٹے بعد اکرام بھی وہاں موجود تھا اور ایک فہرست ان کے سامنے رکھی تھی۔ اس فہرست میں پندرہ آدمیوں کے نام تھے :

”گویا ہمیں ان پندرہ آدمیوں کو چیک کرنا ہو گا۔ تب تو یہ کام زیادہ مشکل ثابت نہیں ہو گا۔“ محمود نے کہا۔  
”ہاں! زیادہ مشکل تو اس وقت ثابت ہوتا جب پندرہ سو

آدمیوں کی فہرست ملتی۔“ فاروق بولا۔

”اور ان پندرہ آدمیوں میں سے بھی ہم کچھ نام خارج کر سکتے ہیں۔ مثلاً جو لوگ یہاں پہلے سے رہ رہے ہیں، وہ کسی ضرورت

سے دوسرے ملکوں کو گئے تھے۔ شاید وہ غیر ملکی ان میں سے نہ ہو۔  
ہاں جو پہلی بار آئے ہیں۔ وہ ان میں سے ضرور ہو سکتا ہے۔ انپکڑ  
جمشید جلدی جلدی بولے۔

لیکن آبا جان! یہاں سوال یہ ہے کہ اس شخص کو جیراج  
کے بارے میں کس سے معلوم ہوا ہوگا۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا  
ہے کہ وہ پہلے سے ہی یہاں رہ رہا ہے اور جرائم پیشہ لوگوں کے  
حالات اسے معلوم ہیں۔

ہوں! یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم اس فہرست  
میں سے کسی کو بھی خارج نہیں کر سکتے۔ پندرہ کے پندرہ آدمیوں  
کو چیک کرنا ہوگا۔

چلیے خیر۔ کوئی بات نہیں۔ پندرہ آدمی اتنے زیادہ نہیں  
ہوتے۔

اکرام۔ ان میں سے پانچ آدمی تم اور تمہارے ماتحتوں کے  
ذمے۔ پانچ میرے اور خان رحمان کے ذمے اور بقیہ پانچ کو محمود،  
فادق اور فرزاد چیک کریں گے۔ اس طرح کام جلد نبٹ جائے  
گا۔ تینوں پارٹیوں میں سے اگر کوئی پارٹی کامیاب نہ ہو سکی تو  
پھر مجھے دوبارہ ایک ایک آدمی کو چیک کرنا ہوگا۔

تو پھر بسم اللہ کیجیے۔  
پہلے پانچ نام اور پتے اکرام کے حوالے کیے گئے، دوسرے

پانچ ان تینوں کے اور آخری پانچ انہوں نے اپنے پاس رکھے۔  
اور تینوں پارٹیاں اس مہم پر روانہ ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔  
اس مہم کا کوئی نام بھی رکھ دینا چاہیے۔ ایسے میں فاروق  
نے کہا۔

تم ہی تجویز کر دو۔ فرزاد نے برا سا منہ بنایا۔  
تلاش مشن۔ اس نے فوراً کہا۔

اُت۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔ محمود نے بوکھلا  
کر کہا اور فاروق اسے تیز نظروں سے دیکھنے لگا، پھر تھلا کر بولا:  
کیا تم میرا مذاق اڑانے کی کوشش میں ہو۔  
کوشش میں نہیں ہے۔ اڑا چکا ہے۔ فرزاد مسکرائی۔

خیر خیر۔ میں تم دونوں کو دیکھ لوں گا۔ اور ہاں۔ یہ واقعی  
کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔ اس نے جل کر کہا۔

اب۔ میں کھڑے جلتے بھنٹے رہو گے یا چلو گے بھی۔  
اد ہو۔ میں اپنے چاقو کو تو بھول ہی گیا۔ کیوں نہ ہم  
پہلے جنگل تک ہو آئیں۔ چاقو وہیں کیس پڑا ہوگا۔  
مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ فاروق سے پوچھ لو۔ فرزاد  
بولی۔

میں بے چارہ کون ہوتا ہوں، اعتراض کرنے والا۔ اس  
نے منہ بنایا۔



تینوں اپنے والد کی کار میں جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔  
انپیکٹر جمشید خان رحمان کی کار میں مشن پر روانہ ہوئے اور اکرام  
اور اس کے ماتحت جیپ میں۔

چاقو انہیں جلد ہی مل گیا۔ اب انہوں نے پہلے غیر ملکی  
کے نام اور پتے پر نظر ڈالی۔ وہ ہوٹل مون لائٹ میں ٹھہرا  
ہوا تھا۔ جلد ہی وہ ہوٹل مون لائٹ میں داخل ہو رہے تھے۔  
"ہمیں کمرہ نمبر ۳۰۱ کے مسافر مسٹر ہنری ٹام سے ملنا ہے۔" محمود  
نے نرم آواز میں کاؤنٹر کلرک سے کہا۔

"میدھے چلے جائیے، لفٹ آپ کو آخری منزل پر لے  
جائے گی۔ کمرہ نمبر ۳۰۱ آخری منزل پر ہے۔" اس نے بتایا۔  
"بہت بہت شکریہ جناب۔" اس نے کہا اور تینوں آگے  
بڑھے۔

"خدا کرے۔ پہلا ہی آدمی مجرم ہو۔" فاروق نے دعا مانگی۔  
"ہمیشہ آسان کام پسند کرتے ہو۔" بھئی اگر ہمیں ان پانچوں کو  
چیک کرنا پڑ گیا تو کوئی قیامت آجائے گی۔" محمود نے بھٹا کر کہا۔  
"وہ تو خیر ہم کسی کو بھی چیک نہ کریں، تو بھی آئے گی۔"  
فاروق بولا۔

"اور ہاں۔ بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ جو شخص ہماری  
موت کا خواہش مند ہے۔ وہ ہمیں اچھی طرح پہچانتا ہو گا۔" فرزانہ

نے گویا خبردار کیا۔

"اللہ مالک ہے۔" فاروق بولا۔

تینوں لفٹ میں سوار ہو کر آخری منزل پر پہنچے۔ لفٹ کے  
ساتھ ہی کمرہ نمبر ۳۰۱ تھا۔ محمود نے دنگ دی۔ دروازہ فوراً ہی  
کھلا اور ایک غیر ملکی نے حیرت زدہ لہجے میں کہا:  
"یس۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

انہوں نے دیکھا۔ وہ ایک چھوٹے سے بد کا آدمی تھا اور اس  
پیلے پر ہرگز پورا نہیں آتا تھا جو انہیں بتایا گیا تھا۔  
"اوہ سوری۔ ہم غلط دروازے پر دنگ دے بیٹھے۔" محمود  
گڑ بڑا کر بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ اس نے مسکرا کر کہا اور دروازہ بند کر لیا۔  
"لو بھئی۔ پہلا وار تو گیا ناکام۔ اب آؤ دوسرے غیر ملکی  
کے ہوٹل چلیں۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔  
ایک ایک کر کے انہوں نے چار غیر ملکی دیکھ ڈالے، اب صرف  
ایک رہ گیا تھا:

"شاید ہم نے غلط راستہ چنا ہے۔ ہمارا مجرم اس طرح ہمیں  
نہیں ملے گا۔" فرزانہ نے منہ بنا کر کہا۔  
"تو پھر کس طرح ملے گا، ترکیب تو تمہاری ہی بتائی ہوئی  
تھی۔" فاروق نے بھٹا کر کہا۔

” ہاں ، لیکن میری ترکیب غلط بھی ہو سکتی ہے۔“  
 ” ابھی ایک غیر ملکی رہتا ہے ، پہلے اسے چیک کر لو ، پھر باتیں کر لینا۔“ محمود جل کر بولا۔

” آج تو تم جلتے پھٹنے میں خرزاد کو بھی دو ہاتھ پیچھے پھوڑ رہے ہو۔“ فاروق حیران ہو کر بولا۔

” دھت تیرے کی۔ کام کم اور باتیں زیادہ۔“ محمود نے جھٹلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

آخر پانچویں غیر ملکی کے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ اس کا کمرہ نمبر اکسٹھ بتایا گیا۔ نہ جانے اکرام کے ماتحتوں نے ان غیر ملکیوں کے ہوٹلوں اور کمروں کے نمبر کس طرح معلوم کر لیے تھے۔ محمود نے کمرہ نمبر اکسٹھ کے دروازے پر دستک دی۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھلا اور ان کی آنکھیں حیرت زدہ انداز میں پھیل گئیں۔ ان کے سامنے جو غیر ملکی کھڑا تھا۔ وہ سرخ و سفید رنگ کا تھا ، اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ لمبا قد اور پتلا دبلا جسم تھا۔ اور سونے پر سہاگر یہ کہ اس کی ناک پکوڑا سی تھی۔

## کمرہ نمبر اکسٹھ

” آپ مسٹر گوگائی ہیں۔“

” ہاں ، کیوں۔ کیا بات ہے۔“

” آپ سے کچھ کام ہے ، کیا آپ ہمیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گے۔“ محمود بولا۔

” کیوں نہیں۔ آئیے۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

تینوں اندر آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ گوگائی بھی ان کے سامنے بیٹھ گیا ، اس کی آنکھوں میں الجھن صاف نظر آرہی تھی۔

” ایک ہفتہ پہلے آپ ہمارے ملک میں آئے تھے اور اس ہوٹل میں آکر ٹھہرے تھے ، اس وقت سے آپ یہاں ہی ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ ہمارے ملک میں کس سلسلے میں آئے ہیں۔“

” لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔



"مجبوری ہے۔ ہمیں پوچھنا ہی پڑتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ اس نے چونک کر کہا۔"

"اگر کوئی غیر ملکی یہاں کسی خطرناک ارادے سے آئے، لیکن ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کون سا غیر ملکی ہے تو پھر ہمیں معلومات حاصل کرنا پڑتی ہیں۔ اب تو آپ میرے سوال کا جواب دیں گے نا۔"

"ضرور کیوں نہیں۔" وہ مسکرایا۔

"تو پھر بتائیے۔ آپ ہمارے ملک میں کس کام سے آئے ہیں؟"

"آپ کے ملک کی سیر کرنے۔ مجھے ملکوں کی سیر کرنے کا شوق جنوں کی حد تک ہے۔ دولت میرے پاس بے تحاشہ ہے، لہذا میں سال میں چھ مہینے دوسرے ملکوں کی سیر کرتا رہتا ہوں اور چھ ماہ اپنے کاروبار کی طرف توجہ دیتا ہوں، امید ہے آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"جی نہیں، بھلا اس میں اعتراض کی کیا بات۔ اعتراض تو ہمیں صرف اس پر ہے کہ کوئی غیر ملکی ہمارے ملک میں نیک ارادے کی بجائے خطرناک ارادے سے آجائے۔ اور ہماری اطلاعات یہی ہیں کہ کم از کم ایک غیر ملکی ایسا ضرور ہے۔ جو غلط ارادہ لے کر آیا ہے۔"

"تب تو آپ کو چاہیے، اسے فوراً گرفتار کر لیں۔" وہ بولا۔  
"جی ہاں! کوشش تو یہی ہے۔ اسی لیے تو ملاقات کرتے پھر رہے ہیں اور اب آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔" فاروق شوخ آواز میں بولا۔

"کک۔ کیا مطلب؟ وہ چونکا۔"

"میرا مطلب ہے۔ ہم باری باری ملک میں آنے والے تمام غیر ملکیوں سے ملاقات کر رہے ہیں۔"

"کیا آپ کا تعلق سی آئی ڈی سے ہے؟"

"جی بس۔ کچھ ایسی ہی بات سمجھ لیں۔"

"میں سمجھ لوں، لیکن مجھے کیا ضرورت ہے سمجھنے کی؟ اس نے گہرا کر کہا۔"

"خیر خیر۔ آپ شوق سے نہ سمجھیے۔ اور اب ہم چلیں گے۔"

"تو آپ کے خیال میں میں وہ آدمی نہیں ہوں؟" اس نے کہا۔

"ابھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب تک سروے مکمل نہ ہو جائے۔"

"شکریہ؟ وہ بولا۔"

تینوں اس سے رخصت ہو کر باہر نکل آئے۔ لفٹ میں سوار ہوئے اور ہال سے گزرنے لگے۔

”کیوں بھئی۔ کیا خیال ہے“ محمود بولا۔

”جیلے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے“ فرزانہ نے کہا۔

”ہاں، لیکن وہ ہمیں دیکھ کر چوزکا ذرا بھی نہیں۔ جب کہ میرے خیال میں ہم پر نظر پڑتے ہی اسے اچھل پڑنا چاہیے تھا۔“

”ہو سکتا ہے، اسے اپنے اوپر بہت زیادہ قابو ہو۔“

”ہاں! بہر حال اتنا ضرور ہے کہ اس جیلے کا ہمیں ایک آدمی مل گیا ہے۔“

”ہاں سے نکلنے سے پہلے فرزانہ نے ایک نظر پورے ہال پر ڈالی اور پھر چونک اٹھی :

”ایک عجیب بات۔“

”اور وہ کیا۔“ محمود رکتے ہوئے بولا۔

”بھئی رکو نہیں۔ یا پھر ہال کی کسی میز پر بیٹھ جاؤ۔ اس

طرح جیسے اچانک پروگرام بنا ہو۔“

”بات کیا ہے؟“

”اب تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ جس سے مل کر ہم آ

رہے ہیں۔ وہی ہمارا شکار ہے۔ اور وہی ہماری موت کا خواہش مند ہے۔“

”لیکن تم نے بات اب تک نہیں بتائی۔“ فاروق نے بھٹا

کر کہا۔

”پہلے کسی میز پر بیٹھ جاؤ۔“

ان کے نزدیک ہی ایک میز خالی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ گئے۔

”ہاں! اب بتاؤ۔“

”میں بتانے لگی ہوں۔ لیکن تم یک دم ادھر ادھر نہ دیکھنا

شروع کر دینا، اس طرح اسے شک ہو جائے گا۔“

”کے شک ہو جائے گا۔“

”ہوٹل کے ہال میں ایک شخص موجود ہے۔ وہ ہمیں تیز

نظروں سے گھور رہا تھا۔ اتفاق سے میں نے اسے گھورتے

ہوئے دیکھ لیا، جو منی میں نے دیکھا، اس نے نظریں فوراً

دوسری طرف کر لیں۔ آخر کیوں؟ فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

”اور وہ کون ہے۔ کس طرف بیٹھا ہے۔“ محمود بے چین ہو گیا۔

”میں ایک بار پھر خیردار کر رہی ہوں۔ فوراً ادھر نہ دیکھنے

لگ جانا۔ بہت احتیاط سے سرسری انداز میں پورے ہال پر نظر دوڑا

ہوئے اسے بھی دیکھ لینا۔“ فرزانہ بولی۔

”اب ہمیں طریقے نہ پڑھاؤ۔ اور یہ بتاؤ۔ وہ کون ہے۔“

”کس طرف بیٹھا ہے۔“

”دائیں طرف۔ یہاں سے تیسری میز پر بالکل اکیلا۔ سیاہ

قام آدمی۔ اب وہ ہماری طرف بہت ہی احتیاط سے دیکھ



لیتا ہے، یہ بات بھی میں نے نوٹ کی ہے۔

محمود اور فاروق نے پوری احتیاط سے کام لیتے ہوئے سہری انداز میں پورے ہل پر نظریں دوڑائیں اور اس دوران انھوں نے اس سیاہ فام کو بھی دیکھ لیا، لیکن اب وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے فرزانہ۔ یہ شخص ہمیں گھور رہا تھا۔“  
 ”ہاں! اس میں ذرا بھی شک نہیں۔“

”ہوں! تب تو ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ جب تک یہ نہ اٹھے۔ ہم اس کا ٹھکانہ معلوم کر کے رہیں گے۔“ محمود بولا۔  
 ”اسی لیے تو میں نے یہاں بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔“ فرزانہ نے پرجوش انداز میں کہا۔

”تو اس میں اس قدر جوش میں بہرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔“  
 فاروق نے منہ بنایا۔

”تم مت بھرو جوش میں۔ تم سے کس نے کہا ہے۔“ فرزانہ جل بھن کر بولی۔

”اس کا گھورنا بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔“ محمود بڑبڑایا۔

”اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ بیٹھا ہوا بھی اسی ہوٹل میں ہے جس میں غیر ملکی بھی موجود ہے۔“ فرزانہ بولی۔

”ہوں! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم بہت تیزی سے کامیابی

کی طرف بڑھ رہے ہیں۔“

”وہ اٹھ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میرا ہمارے پاس آکر پوچھے کہ کیا لاؤں۔ ہمیں بھی نیکل جانا چاہیے۔“ فاروق نے مشورہ دیا۔  
 ”اور اگر یہ ہمارے نکلنے کے فوراً بعد باہر نہ آیا تو۔“  
 ”بھئی وہ تو اٹھ بھی چکا ہے۔ باہر نہیں جائے گا تو کہاں جائے گا۔“ فاروق تملک کر بولا۔

”ہوں! بات تو ٹھیک ہے۔ تو پھر۔“

محمود کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہیں رہے تھے کہ سیاہ فام آدھی نہ تو سکاؤنٹر کی طرف گیا تھا اور نہ بیرونی دروازے کی طرف۔ بلکہ وہ سیدھا لفٹ کی طرف جا رہا تھا۔

”لو فاروق کے اندازے دھڑے کے دھڑے رہ گئے۔ یہ ضرور اس غیر ملکی سے ملنے جا رہا ہے۔“ فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

”خیر، ابھی یہ تو نہیں کہا جاسکتا۔“ اس نے بھی جل کر کہا۔

”تو پھر آؤ۔“ دیکھ لیتے ہیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔“ محمود بولا۔

تینوں اٹھے، ہاتھ کہ میرا سر پر آکھڑا ہوا، وہ انھیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا:

”ہمیں ذرا اوپر جانا ہے۔“

”بہت بہتر!“ اس نے کہا اور بُرا سا منہ بناتا ہوا پیچھے ہٹا۔

گیا۔

وہ لفٹ کی طرف چلے۔ اس وقت تک سیاہ فام آدمی لفٹ میں سوار ہو کر دروازہ بند کر چکا تھا۔ انہیں انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ لفٹ نیچے آگئی، اب وہ لفٹ میں سوار ہوئے اور اوپر والی منزل پر پہنچے۔ کمرہ نمبر آکسٹھ کے دروازے پر رُک کر پہلے تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر برآمدے میں کسی کو نہ پا کر محمود نے تالے کے سُورخ پر نظرین جمادیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ پیچھے ہٹ آیا۔ اب فاروق اور فرزانہ نے بھی اندر دیکھا اور سیدھے ہو گئے۔

سیاہ فام اندر موجود تھا اور غیر ملکی کے سامنے کھڑا دبی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔



محمود نے اشاروں میں انہیں کہا :

”اب یہاں رکن مناسب نہیں۔ آؤ جلدی کرو۔“

تینوں نیچے اتر آئے۔ اور پھر اسی میز پر آ بیٹھے، فوراً ہی بیرا آدھکا :

”ہاں بھئی۔ آپ بھی کچھ لے ہی آئیں۔“ محمود بولا۔

”کچھ کیا سر!“

”بھئی تین کو کا کولا لے آئیں اور کیا۔“ اس نے کہا اور بیرا

چلا گیا۔

ابھی بیرا کو کا کولا نہیں لایا تھا کہ سیاہ فام لفٹ سے اترتا نظر آیا، اب وہ بیرونی دروازے کی طرف تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا۔

”اب کیا کریں، بیرے صاحب تو بوتلیں لینے کے لیے جا چکے ہیں۔“

”مجبوری ہے، ہم کس طرح رُک سکتے ہیں، ہمیں کیا معلوم تھا، یہ اس قدر جلد آجائے گا۔“

”تو پھر آؤ۔“ یہ کہتے ہوئے محمود نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور آٹھ کھڑا ہوا۔

سیاہ فام اس وقت دروازے سے نکل چکا تھا۔ انہوں نے تیز تیز قدم اٹھائے ہی تھے کہ بیرے کی آواز کانوں سے ٹھوکانی :

”ارے جناب۔ کہاں چل دیے۔ بوتلیں حاضر ہیں۔“

”سوری ! اب ہمارے پاس ان کے پینے کا وقت نہیں رہا۔“ محمود بولا۔

”لیکن بوتلیں کھل چکی ہیں۔“



"ہاں! ہم جانتے ہیں۔ کہ آپ بوتلیں کھول کر لاتے ہیں۔ لہذا بل میز پر چھوڑ آئے ہیں۔"

"اوہ! بھرا اور کچھ نہ کہہ سکا۔"

وہ باہر نکلے تو سیاہ فام ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔ انھوں نے فوراً کار کا رخ کیا۔ اس سے پہلے کہ ٹیکسی روانہ ہوتی، وہ کار میں بیٹھ چکے تھے۔

"بھئی وہ ہمیں جانتا ہے۔ اس لیے بہت محتاط رہ کر تعاقب کرنے کی ضرورت ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ٹھیک ہے، تم فکر نہ کرو۔" محمود بولا۔

تعاقب جاری رہا۔ یہاں تک کہ ٹیکسی ایک اور ہوٹل کے سامنے رکی۔ انھوں نے سیاہ فام کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا۔

"اب کیا کریں؟" محمود نے کار روکتے ہوئے کہا۔

"کم از کم ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا نام کیا ہے۔"

کون سے کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے اور پھر انکل اکرام کے ذریعے ایک سادہ لباس والا مقرر کرا دینا چاہیے۔ جو اس پر نظر رکھے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ آؤ۔"

وہ کار سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہوئے اور کاؤنٹر کی طرف بڑھے۔

"یہاں ایک صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔ سیاہ فام ہیں۔ کیا آپ

ان کے کمرے کا نمبر بتا سکتے ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ وہ ہمارے بہت اچھے گاہک ہیں۔ جب بھی اپنے ملک سے ہمارے ملک میں آتے ہیں، ہمارے ہاں ہی ٹھہرتے ہیں۔"

"شکریہ جناب۔ آپ نے کمرے کا نمبر نہیں بتایا۔"

"آپ کو ان سے کیا کام ہے؟"

"آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ان کی ہدایت یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے بارے میں کچھ پوچھے تو پہلے ان سے اجازت لے لی جائے، پھر ان کے بارے میں بتایا جائے۔" اس نے بتایا۔

"ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم ہوٹل سے باہر ان سے مل لیں گے۔" محمود نے برا مان کر کہا۔

"جی۔ کیا مطلب۔ آپ ملاقات کی وجہ نہیں بتانا چاہتے۔"

"جی نہیں۔"

"تو پھر اپنے نام بتا دیں۔"

"ہم نام بھی نہیں بتا سکتے۔"

"تب میں ان کے کمرے کا نمبر نہیں بتا سکتا اور ان کا نام بتا سکتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔ آؤ جی چلیں۔"

تینوں باہر نکل آئے۔ محمود نے فوراً ایک پیسک فون بوتھ سے اکرام کو فون کیا :

”سیلو انکل۔ ہوٹل جانیاز میں ایک سیاہ خام ٹھہرا ہوا ہے، یہاں فوری طور پر دو آدمی مقرر کر دیں۔ اس کی نگرانی ہر صورت اور ہر وقت جاری رہنی چاہیے۔ ایک سادہ لباس والا صدر دروازے پر اور ایک پچھلے دروازے پر۔“

”اچھی بات ہے۔ میں ابھی دو آدمی بھیج رہا ہوں۔“  
”جب تک آپ کے آدمی نہ آئیں گے۔ ہم یہاں سے نہیں ٹپس گئے۔“

”ٹھیک ہے۔ یہی مناسب ہے۔“ اس نے کہا اور ریسپور رکھ دیا۔

”میں پچھلے دروازے پر جا رہا ہوں۔ کہیں کاؤنٹر کلرک اسے اطلاع نہ دے دے اور وہ اس طرف سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔“ محمود نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم یہاں موجود رہیں گے اور انشاء اللہ اسے فرار نہیں ہونے دیں گے۔“ فاروق بولا۔

”لیکن ہم اسے کیس جانے سے روکیں گے۔ بھی نہیں سمجھے۔“ محمود نے اسے گھورا۔

”تو اس میں گھورنے کی کیا بات ہے؟“

”وقت نہ ضائع کرو۔“ فرزانہ بستا آٹھی اور محمود تیز تیز قدم اٹھاتا ہوٹل کے پچھلے دروازے کی طرف چلا گیا اور پھر زور سے چونکا، سیاہ خام دروازے سے نکل رہا تھا اور سڑک کے دوسری طرف کھڑی ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ محمود گھبرا گیا، کیونکہ اس پاس کوئی ٹیکسی موجود نہیں تھی۔ اس نے جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھا اور پھر صدر دروازے کی طرف بھاگا۔ فاروق اور فرزانہ نے جو اسے بھاگتے دیکھا تو حیران رہ گئے، لیکن اس سے پہلے کہ کچھ سمجھ سکتے۔ محمود کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ انھیں بھی بٹھا سکتا۔ انھوں نے اس کی طرف دوڑ بھی لگائی، لیکن وہ نکلا چلا گیا :

”شاید سیاہ خام پچھلے دروازے سے فرار ہو رہا ہے۔“ فرزانہ بولی۔

”ہاں! ضرور یہی بات ہے، ورنہ محمود اس طرح بدحواس ہو کر نہ جاتا۔“

”گویا انکل اکرام کے ماتحتوں کا یہاں پہنچنا بے فائدہ گیا۔“  
”ہاں، لیکن ہم دونوں کیا کریں۔ یہیں ٹھہر کر محمود کا انتظار کریں یا۔“ فاروق جلدی جلدی کہہ رہا تھا کہ فرزانہ بول آٹھی :  
”یہاں ٹھہر کر انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں چاہیے کوئی ٹیکسی پکڑ کر محمود کے پیچھے چل پڑیں۔ کیا خبر اسے ہماری



ہے بھی سیاہ فام۔ ہم اس کے فرار کے راستے تو بند کر ہی  
سکتے ہیں۔“

”ہوں! بالکل ٹھیک۔“  
محمود نے اب پھر پبلک فون بوتھ سے اکرام کو فون کیا،  
اس کی آواز سننے ہی اکرام بولا:  
”بھئی گھبراؤ نہیں۔ دونوں آدمی ہوٹل تک پہنچنے ہی والے  
ہوں گے۔“

”اب اس کا کوئی فائدہ نہیں اٹکل۔ وہ ہوٹل سے نکل بھاگا  
اور ہم اسے کھو بیٹھے ہیں۔ وہ ایک سیاہ فام غیر ملکی آدمی  
ہے۔ اب اس کی کوشش یہ ہوگی کہ ملک سے فرار ہو جائے۔  
اس سلسلے میں آپ کیا کر سکتے ہیں۔“  
”فکر نہ کرو۔ میں اس کے راستے بند کراتے دیتا ہوں۔  
اور کچھ۔“

”اس کا حلیہ نوٹ کر لیں۔“  
”ہاں، ٹھیک ہے۔ لکھواؤ۔“  
”اس کا قد درمیانہ ہے، جسم بھاری بھر کم، آنکھوں میں تیز  
چمک۔ بہت چالاک نظر آتا ہے۔ رنگ بالکل سیاہ، سر کے  
بال گھنگھریالے۔ میرا خیال ہے۔ اتنا ہی حلیہ کافی ہے۔“  
”ہاں! بہت ہے۔“ اس نے کہا اور ریسپورڈر رکھ دیا

مدد کی ضرورت پڑ جائے۔“

”ہوں، مشورہ معقول ہے۔ تو پھر آؤ چلیں۔“

انہوں نے ایک گزرتی ٹیکسی روکی اور اس سمت میں روانہ  
ہو گئے جس طرف محمود کار لے گیا تھا۔ ایک جگہ انہیں محمود  
کی کار نظر آئی۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ انہوں نے  
ٹیکسی اس کے برابر رکوالی۔ فرزانہ نے سر باہر نکال کر کہا:  
”کیوں۔ کیا بات ہے۔“

”دیکھتی نہیں۔ میں چوراہے پر کھڑا ہوں۔ مجھے کیا معلوم  
وہ کس طرف گیا ہے۔“

”تب پھر تم سامنے والی سڑک پر جاؤ۔ میں دائیں طرف  
جاتی ہوں، فاروق ایک اور ٹیکسی پکڑ کر تیسری سڑک پر  
جائے گا۔“

”لیکن۔ ہم اس کی ٹیکسی کو کس طرح پہچانیں گے۔ شہر میں  
تو سڑکوں پر سیکڑوں ٹیکسیاں دوڑ رہی ہیں۔ یہ تو اسی وقت  
مفید تھا جب اس کی ٹیکسی ہماری نظروں میں رہتی۔“  
”اوہ! گویا ہم اسے کھو چکے ہیں۔“

”ہاں! اس کے سوا۔ ارے۔ ہوٹل کے کلرک نے کہا  
تھا۔ وہ جب بھی اپنے ملک سے آتا ہے، ان کے ہوٹل میں ہی  
ٹھہرتا ہے۔ گویا وہ بھی کسی دوسرے ملک سے آیا ہوا ہے۔“

"اب ہم اپنا کام مکمل کر چکے ہیں۔ ارے۔ ان سادہ لباس والوں کے ذریعے ہم سرخ و سفید غیر ملکی کی نگرانی تو کرا ہی سکتے ہیں۔ یہ تو ہم بھول ہی گئے۔ آؤ جلدی کرو۔ انکل اکرام کے آدمی پہنچ چکے ہوں گے اور ہماری گم شدگی پر حیران ہو رہے ہوں گے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے، حیران ہونا صحت کے لیے بہت مفید ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

وہ واپس ہوٹل جانا باز کے سامنے پہنچے۔ ایک سادہ لباس والا حیران پریشان چادروں طرف دیکھ رہا تھا، جو نہی اس کی نظر ان پر پڑی۔ وہ تیر کی طرح ان کی طرف آیا :

"آپ لوگ کہاں چلے گئے تھے؟"

"اس کے پیچھے جس کے لیے آپ لوگوں کو تکلیف دی تھی۔"

"کیا مطلب۔ کیا وہ فرار ہو گیا؟"

"جی ہاں، لیکن ایک دوسرے ہوٹل کے کمرہ نمبر اکسٹھ میں ایک اور غیر ملکی موجود ہے۔ آئیے ہم آپ کو وہاں لے چلیں، اب آپ اس کی نگرانی کریں گے۔"

"چلیے۔ ہمیں تو نگرانی کرنی ہے۔ جس کی بھی کرا لیں۔ اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

اور وہ مسکرا دیے۔ سادہ لباس والے کے دوسرے ساتھی کو

بھی بلا لیا گیا۔ جلد ہی وہ اس ہوٹل تک پہنچ گئے اور پھر اکرام کے آدمیوں کو مقرر کر کے واپس ہوٹل شام لال پہنچے۔ دونوں پارٹیاں ان سے پہلے ہی واپس آ چکی تھیں۔ انپیکٹر جمشید جھنجھلا کر بولے :

"اتنی دیر لگا دی۔ ہم کب سے انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔"

"ہمیں بہت افسوس ہے آیا جان۔"

"خیر۔ تلاش کا کیا رہا؟"

"اپنے خیال کے مطابق ہم اس غیر ملکی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔"

"اوہو اچھا۔ پھر تو وہ مارا۔ اور اب ہمیں تمہارے دیر

لگانے کا کوئی افسوس نہیں رہا، جلدی بتاؤ۔ وہ کہاں ہے؟"

"ہوٹل بلیوسٹار۔ کے کمرہ نمبر اکسٹھ میں۔ اس کا ایک ساتھی

بھی ہے۔ وہ ہوٹل کے ہال میں موجود تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ

کمرہ نمبر اکسٹھ میں گیا اور پھر وہاں سے نکل گیا، ہم نے ایک

اور ہوٹل تک اس کا پیچھا کیا۔ اس ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک نے

ہمیں تو اس کے کمرے کا نمبر بتایا نہیں؛ البتہ اسے یہ بتا دیا کہ

کوئی اس کی تلاش میں ہے۔ لہذا وہ بھاگ نکلا اور ہم نے اسے

کھو دیا؛ تاہم ہم انکل اکرام کو خبردار کر چکے ہیں۔"

"چلو خیر۔ یہ بھی بہتر ہے۔ اصل غیر ملکی تو ابھی موجود ہے نا،



کیا اس کی نگرانی ہو رہی ہے؟  
”جی ہاں!“

”تب پھر ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ آؤ چلیں۔“  
اکرام کو بلایا گیا، پھر وہ کاروں میں بیٹھ کر پہلے حیراج تک پہنچے۔ انپکٹر جمشید نے اسے ساتھ لیا اور ہوٹل بیوسٹار پہنچے۔ کاؤنٹر کلرک سے کچھ کہے بغیر وہ سیدھے لفٹ تک آئے اور اس میں سوار ہو کر اوپر پہنچے۔ انپکٹر جمشید نے دستک دی۔ جونہی دروازہ کھلا، غیر ملکی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ ادھر حیراج اچھل پڑا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”کیوں حیراج۔ وہ یہی تھا نا؟“

”جی ہاں“ وہ ہکھلایا۔

”کیا مطلب؟“ غیر ملکی نے بوکھلا کر کہا۔

”ہاں۔ مطلب بھی آپ کو بتا دیا جائے گا۔ چلو اکرام، اپنا

کام کرو۔“

اکرام کے ماتحت ہتھکڑی لے کر اس کی طرف بڑھے تو وہ

بھڑک کر پیچھے ہٹا:

”یہ۔ یہ کیا؟“

”انہیں ہتھکڑیاں کہتے ہیں، آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم۔“

”لیکن میں نے کیا کیا ہے؟“

”اس بوڑھے شخص کو ہمارے ساتھ دیکھ کر بھی تم یہ سوال کرو گے۔“

”اوہ۔ لگ۔ کیا۔ کیا تم انپکٹر جمشید ہو۔“ اس نے بوکھلا

کر کہا۔

”آپ نے ٹھیک سمجھا اور ہم محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔“ فاروق شوخ آواز میں بولا۔

ان تینوں پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ سر جھک گیا۔ اکرام کے ماتحت نے ہتھکڑیاں اس کے ہاتھ میں ڈال دیں۔

## میں ابھی آیا

محکمہ سرانجامی کے دفتر میں غیر ملکی ان کے سامنے بیٹھا تھا،  
اور سب لوگ کمرے میں موجود تھے :

"ہاں تو جناب۔ سب سے پہلے تو اپنا نام بتادیں۔"

"مجھے ماسٹر راجر کہتے ہیں۔ اس نے کہا۔"

"تو تم یہاں ہمارا کام تمام کرنے کے لیے آئے تھے، لیکن کیوں؟"

"یہ میرا پیشہ ہے۔ اس نے کہا۔"

"کیا مطلب؟ وہ چونکے۔"

جواب میں ماسٹر راجر نے ایک اندرونی جیب میں سے وہ

تحریر نکال کر ان کے سامنے کر دی جو اسے موصول ہوئی تھی۔

انھوں نے تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھا، پھر انپیکٹر جمشید بولے :

"گویا تمہیں اس ملک سے ہی کسی نے بلایا ہے۔"

"ہاں! اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے؟ اس نے کہا۔"

"اور وہ سیاہ فام کون ہے؟" انپیکٹر جمشید نے بغور اس کی طرف

دیکھا۔ ماسٹر راجر چونک اٹھا :

"تو آپ کو اس کا بھی پتا ہے؟"

"ہاں، لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ تو وہ

تمہارا ساتھی ہے۔"

"ہاں! بہت اچھا ساتھی، ہر کام میں میرا ساتھی۔ اس

نے بتایا۔"

"لیکن جب اس قسم کے کام تم اپنے ملک میں خود کرتے ہو

تو یہاں ہوٹل شام لال کے مینجر سے یہ کام کیوں لیا؟"

"ایک نئے ملک میں نیا آدمی مار کھا جایا کرتا ہے، لیکن ملک

کا آدمی مار نہیں کھاتا، اسے راستوں کا پتا ہوتا ہے، ماحول کا پتا

ہوتا ہے، اس لیے میں نے یہ کام خود نہیں کیا۔"

"لیکن تمہیں خیراج کے بارے میں کس نے بتایا تھا؟"

"ٹشکی نے۔ اسے یہاں کے کچھ حالات معلوم ہیں، یہاں اس

کے ایک دو دوست رہتے ہیں۔"

"ٹشکی کون؟ انھوں نے پوچھا۔"

"وہی میرا سیاہ فام ساتھی۔"

"ہوں، کیا وہ پہلے بھی یہاں آتا رہتا ہے؟"

"نہیں! ہمیں تو وہاں ہی بہت کام ہوتا ہے۔ یہاں کس

طرح آسکتے ہیں۔"



”کیا مطلب؟ محمود آچل پڑا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔“

”کیوں کیا ہوا، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“  
 ”ٹنگی والے ہوٹل کے کمرک نے کہا تھا۔ وہ جب بھی آتے ہیں، ہمارے ہی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں اور یہ بھی کہ بہت اچھے لگا ہک ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نے ہمیں تو اس کے کمرے کا نمبر بتایا نہیں، اسے یہ بتا دیا کہ ہم اس کی تلاش میں ہیں اور اسی لیے وہ بھاگ نکلتے ہیں کامیاب ہو گیا۔“

”ہوں! تب تو ہوٹل جانا باز کی نگرانی ہونی چاہیے اور اس کے مینجر سے ملاقات کرنی چاہیے۔ ان لوگوں کو ٹنگی کے بارے میں ضرور معلوم ہو گا۔ لو اکرام تم ذرا اس کا خیال رکھا، ہم سیاہ فام کو لے کر آتے ہیں۔ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔“

”جی کیا فرمایا۔ لے کر آتے ہیں، تو کیا آپ کو یقین ہے۔ سیاہ فام وہیں ہو گا۔“

”ہاں بالکل۔ کاؤنٹر کلرک کے الفاظ سے یہی ظاہر ہے۔“  
 دو سادہ لباس والوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے، کلرک انہیں دیکھ کر چونک اٹھا۔

”ہاں تو سیاہ فام کہاں ہے؟“  
 ”جی۔ وہ۔ وہ تو جا چکے ہیں۔“

”اچھا تو پھر ہم تلاشی لیں گے اور اگر ہم نے سیاہ فام کو ہوٹل سے برآمد کر لیا تو پھر تم بھی اس کے ساتھ حوالات میں ہو گے۔“

”آپ۔ آپ ہوٹل کے مینجر سے بات کر لیں جناب۔ یہ ان کی ہدایت ہے کہ میں کسی مسافر کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔“

مینجر کا کمرہ کون سا ہے؟ انہوں نے ہنسا کر کہا۔  
 ”وہ رہا۔ سامنے۔“

”محمود۔ تم یہیں ٹھہرو۔ اسے کوئی فون نہ کرنے دینا۔ آؤ فاروق، فرزاد۔“

تینوں مینجر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئے کہ اندر سیاہ فام موجود تھا۔



”بہت خوب! تو آپ یہاں ہیں۔ بھئی کمال ہے۔ یہاں سے تو آپ فراد ہو گئے تھے۔“

سیاہ فام اور مینجر ساکت بیٹھے رہ گئے۔

”کیا آپ لوگوں کا بھی آپس میں کوئی گٹھ جوڑ ہے؟“



"نہیں جناب! یہ ہمارے گاہک ہیں اور بس۔" مینجر نے فوراً کہا۔  
 "کیوں مسٹر ٹنگی!" انپکٹر جمشید طنز یہ لہجے میں بولے۔  
 "ہاں یہ ٹھیک ہے۔"  
 "نیر۔ میں آپ کو ماسٹر راجر کا ساتھی ہونے کی وجہ سے  
 گرفتار کرتا ہوں، ہم انہیں بھی گرفتار کر چکے ہیں۔"  
 "یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"  
 "تم لوگ یہاں مجھے اور میرے بچوں کو ہلاک کرنے کے ارادے  
 سے آئے تھے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔"

سیاہ فام کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

"ماسٹر مینجر۔ آخر ٹنگی آپ کا کس حد تک خاص گاہک ہے کہ آپ  
 کا کلرک تک کسی کو ان کے بارے میں کچھ بتانے پر تیار نہیں  
 ہوتا۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولے۔  
 "ہم اپنے گاہکوں کی تمام خواہشیں پوری کرتے ہیں۔ یہ انہی  
 کی خواہش تھی کہ ان کے بارے میں کوئی بھی پوچھے تو نہ بتایا  
 جائے، کیوں مسٹر ٹنگی۔"

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ  
 تم اپنے ہوٹل میں جرائم پیشہ لوگوں کو مسافر ٹھہراتے ہو اور ان سے  
 کئی گنا زیادہ کرایہ وصول کرتے ہو، لہذا تم بھی مجرم میں شریک  
 ہو۔" ٹنگی بولا۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مسٹر ٹنگی۔" مینجر بوکھلا اٹھا۔  
 "میں بالکل درست کہہ رہا ہوں، جب میں پھنس گیا تو دوسرے  
 کیوں عیش کریں۔ انپکٹر صاحب اس ہوٹل کی تلاشی لے لیں، اس  
 وقت بھی پچاس کے قریب جرائم پیشہ لوگ یہاں موجود ہوں گے۔"  
 "ہوں! محمود۔ پولیس کو فون کرو۔ انہیں ہدایات دو کہ  
 غیر محسوس طور پر ہوٹل کو گھیرے۔ میں لے لیں۔"

"جی بہتر!"

سب کی گرفتاری کے بعد وہ ٹنگی کو لے کر محکمہ سرانصرسانی کے  
 دفتر پہنچے۔ سیاہ فام کو دیکھ کر غیر ٹنگی کا چہرہ اور بھی ڈھیللا  
 پڑ گیا، اس نے بھی بھی مسکراہٹ سے کہا:  
 "تو تم بھی پھنس گئے ٹنگی۔"

"ہاں ماسٹر۔ افسوس!"

"لیکن ٹنگی۔ تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ یہاں کس سلسلے  
 میں آیا کرتے تھے۔"

"اوہ! تو آپ کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے۔"

"ہاں! ان لوگوں کی مہربانی سے۔ تم نے بتایا نہیں۔ یہاں  
 کس سلسلے میں آتے تھے اور اگر آتے تھے تو مجھ سے یہ بات  
 کیوں چھپاتے تھے۔" ماسٹر راجر کے لہجے میں شدید الجھن تھی، بے  
 چینی تھی۔



” چھوڑیے اس بات کو ، اب کیا فائدہ “

” نہیں نہیں — مجھے یہ بات ضرور بتاؤ “

اچانک انپکٹر جمشید کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے —  
اچانک وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے :  
” میں ابھی آیا “

وہ حیران ہوئے ، بغیر نہ رہ سکے — انپکٹر جمشید دفتر سے باہر جا  
چکے تھے — آدھ گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی تو چہرہ چمک رہا تھا ،  
ہاتھ میں ایک بڑا سا رجسٹر تھا —

” معلوم ہوتا ہے — آپ کو کوئی بہت ہی خاص بات معلوم  
ہو گئی ہے “ — فرزانہ بے چین ہو کر بولی —

” ہاں ! تمہارا خیال ٹھیک ہے “ — وہ مسکرائے ، پھر کدسی پر  
بیٹھ گئے — اب ہر کوئی بے قراری کے عالم میں ان کی طرف دیکھ  
رہا تھا ، آخر انھوں نے کہنا شروع کیا :

” اس وقت تک حالات یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ملک کا  
کوئی شخص میری اور میرے بچوں کی موت کا خواہش مند ہے ، اس  
نے یہ کام ماسٹر راجر سے لینا چاہا ، ماسٹر راجر اپنے ملک میں اس قسم  
کے کام کرتا رہتا ہے ، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس شخص نے  
یہاں آکر یہ کام خود کرنے کی بجائے کسی دوسرے سے لینا چاہا ،  
اور جیراج کے ذریعے ہوٹل شام لال کے میجر سے یہ کام لینے کا

پرودگام بنایا ، لیکن وہ ناکام رہا — اور ہم اس تک پہنچ گئے —  
جیراج کے بارے میں ماسٹر راجر کوٹنگی نے بتایا تھا — اب سوال  
صرف اور صرف یہ ہے کہ ماسٹر راجر کو وہ تحریر کس نے لکھی تھی —  
یہ اس کیس کا آخری سوال ہے — اس سوال کا جواب معلوم ہوتے  
ہی کیس ختم ہو جائے گا “ — یہاں تک کہ کہ انپکٹر جمشید خاموش ہو  
گئے —

” آخری سوال — یہ تو — یہ تو “ — فاروق ہسکلا کر رہ گیا —

” ہاں ہاں کہہ دو — یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے “ — فرزانہ جل  
کر بولی —

” تو تم کیوں جلی جا رہی ہو ، اگر یہ کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے ،  
تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے “ — فاروق نے منہ بنایا —

” آبا جان کے سوال کا جواب دو “ — محمود نے منہ بنایا —

” سوال کا جواب دیں ، انھوں نے ہم سے کب کوئی سوال کیا

ہے — کیوں آبا جان — کیا آپ نے ہم سے کوئی سوال کیا ہے “ — فاروق

حیران ہو کر بولا —

” کیا تو نہیں ، لیکن اگر تم اس سوال کا جواب دے دو تو کیا ہی

بات ہے “ — انپکٹر جمشید مسکرائے —

” ہم جواب دے دیں ، لیکن کس طرح آبا جان “

” جب میں نے حالات کا جائزہ لیا تو یہ بات مجھے بہت کشمکش کی



ٹنکی ہمارے ملک میں پہلے بھی آتا رہا ہے، لیکن اپنے باس کو بتائے بغیر۔ غالباً یہ چھٹی کہیں اور جانے کے لیے لیتا ہو گا اور آتا ہو گا ادھر۔ ہوٹل جانبار کے کاؤنٹر کلرک نے بتایا تھا کہ یہ ہمارے بہت اچھے گاہک ہیں، لیکن اب یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ وہ ہوٹل اسی قسم کے لوگوں کو مسافر ٹھہراتا تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ ٹنکی اپنے باس سے پوری چھپے یہاں آتا رہتا تھا۔ آخر کیوں۔ جب میں نے اس آخر کیوں پر غور کیا تو مجھے ٹنکی عجیب و غریب شخص محسوس ہوا۔ اور پھر میں نے یہاں سے جا کر ایک پیجز کا جائزہ لیا۔ اب میں ماسٹر راجر سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ ٹنکی کون کون سی زبان جانتا ہے۔

”انگریزی، فرانسیسی۔“

”اور تم خود۔“

”میں اُردو بھی جانتا ہوں۔“

”لیکن میرا دعویٰ ہے کہ ٹنکی تم سے بھی بہتر اُردو جانتا ہے۔“

”کک۔ کیا مطلب؟“ ماسٹر راجر زور سے اُچھلا۔

”ہاں! اس آخری سوال کا جواب یہی ہے کہ وہ تحریر ٹنکی

نے خود ہی لکھی تھی اور یہاں سے پوسٹ کر دئی تھی۔ ہوٹل کے مینجر دوست نے اس تحریر کو پوسٹ کیا اور دس ہزار ڈالر بھیجے تھے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تحریر ٹنکی نے خود لکھی تھی،

میں اس کا ثبوت حاصل کر چکا ہوں۔“

”اوہ!“

”وہ دھک سے رہ گئے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل

گئیں۔ انپکٹر جمشید نے ماسٹر راجر کو ملنے والا خط سب کے سامنے

کھول کر رکھ دیا، ایسے میں فرزاد نے حیران ہو کر پوچھا:

”لیکن آبا جان! اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ماسٹر راجر اس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ جستہ لیتا تھا،

ان کے ادارے کا نام جرائم کی دنیا میں بہت مشہور ہے۔

اس قسم کے کام کرانے والے لوگ صرف اور صرف ان کے

ادارے سے کام کرانا پسند کرتے ہیں، لہذا ٹنکی بنے منصوبہ

بنایا کہ اگر ماسٹر راجر کو ٹھکانے لگا دیا جائے تو اس کے

دارے نیارے ہیں، لیکن ماسٹر راجر کو ٹھکانے لگانا بہت

خطرناک کام تھا، پولیس صرف اور صرف اس پر شک کرتی۔

چنانچہ اس نے ایک ایسا طریقہ سوچا کہ سانپ بھی مر جائے اور

لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہاں آتے جاتے اسے ہمارے بارے میں

معلوم ہو گیا اور اس نے سوچا، کیوں نہ راجر کے ہاتھوں ہمیں

ہلاک کرانے کا پروگرام بنایا جائے۔ راجر ہمیں ہلاک تو کر نہیں

سکے گا، خود گرفتار ضرور ہو جائے گا۔ اور جب وہ گرفتار ہو

جائے گا تو یہ چپ چاپ تے یہاں سے نکل بھاگے گا، لیکن اس



کی بد قسمتی کہ تم اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اسے گھورتے دیکھ  
لیا، اس طرح اس کا تعاقب کیا گیا۔ اور یہ قابو آ گیا۔ یہ ہے  
کل کہانی۔ کل منصوبہ۔

”اے خدا۔ یہ تو بہت گھماؤ پھراؤ والا منصوبہ تھا۔“ فاروق  
گھبرا کر بولا۔

”لیکن اٹنا یہی لوگ ہمارے گھماؤ پھراؤ میں آ گئے۔“ محمود بولا۔  
”خدا کا شکر ہے کہ ہماری بجائے یہ لوگ آ گئے۔ ورنہ اس  
وقت ہم کہاں ہوتے۔“ فرزانہ نے کانپ کر کہا۔

”اللہ اپنا رحم فرمائے۔ ہمارے خلاف بھی کیسے کیسے منصوبے  
بناتے ہیں۔“ فاروق بولا۔

”یہ اللہ کی ہی تو مہربانی ہے۔ جو اس قسم کے منصوبوں سے  
ہمیں بال بال بچا لیتا ہے۔“ فرزانہ نے کہا۔  
”چلیے پھر آتا جان۔ لے چلیے ان لوگوں کو۔“

انہوں نے سب پر ایک نظر ڈالی۔ ماسٹر راجر ابھی تک حیرت  
زدہ انداز میں ٹشکی کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں اس  
کے لیے نفرت اور انتقام کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا، آخر اس  
نے سانپ کی طرح پھنکار کر کہا:

”تم میری آستین کے سانپ تھے۔ میں تمہیں پالتا رہا اور تم نے  
مجھے ہی ڈس لیا۔ افسوس۔ اب کما لودن رات دولت۔“

ٹشکی کا سر جھک گیا، اس نے منہ سے کچھ بھی نہ کہا اور وہ  
اٹھ کھڑے ہوئے:

”ہر کیس کے آخر میں آخر ہمیں اپنے گھر جانا پڑتا ہے۔ آخر  
کسی کیس کا انجام اس سے مختلف کیوں نہیں ہوتا۔“ فاروق نے  
برا سامنہ بنا کر کہا اور وہ سب مسکرانے لگے۔